

الله
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
رَبِّ الْجَنَّاتِ
رَبِّ الْعِزَّةِ
رَبِّ الْعِزَّةِ

ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا

قرآنی تمثیلات و تشییهات

وَلَقَدْ حَسِنَ جَنَا لِلَّهِ أَنْ فِي هَذِهِنَّ الْقُرُونِ مِنْ كُلِّ مَمْلَكٍ
لَعَلَّهُمْ يَذَكَّرُونَ

اور ہم نے لوگوں کے (سمجھانے کے) لئے اس قرآن میں ہر طرح کی مثالیں بیان
کی ہیں تاکہ وہ نصیحت پکڑیں (سورۃ الزمر: 27)



پیش لفظ

کیا آپ نے کبھی خود کو زندگی کے پیچیدہ راستوں میں کھویا ہوا محسوس کیا ہے؟ دل میں رہنمائی کی توبہ لیے کسی ایسے روشن چراغ کی تلاش کی ہے جو آپ کے سفر کو پر نور کر دے؟ قرآن پاک ہی وہ مشعل راہ ہے جو زندگی کے دور اہوں پر ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ اس کی آیات میں تمثیلات کے موتی خوبصورتی سے پروئے گئے ہیں۔ ایسی حکمت سے بھر پور مثالیں جو ہمارے ذاتی تجربات کا عکس پیش کرتی ہیں۔

یہ تمثیلات محض کہانیاں نہیں ہیں؛ یہ زندہ، جاگتی تشبیہات ہیں جو کائنات کے رازوں کو آشکار کرتی ہیں۔ ایک شفیق استاد کی طرح، زمین و آسمان کا خالق اپنے کلام پاک میں ان کے ذریعے ہمارے دلوں اور ذہنوں کو بیدار کرتا ہے۔ وہ ہمیں ترغیب دیتا ہے کہ ہم اپنی ذات کی گہرائیوں میں جھانکیں، معمولات سے بالاتر ہو کر غیر معمولی کی تلاش میں نکلیں۔

ان مثالوں کے ذریعے ہمیں روزمرہ کے تجربات میں پوشیدہ حکمت کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ قدیم اور جدید دور کے علماء کرام نے ان تمثیلات پر غور کر کے حکمت کے ایسے موتی جمع کیے ہیں جو ہمیں اللہ کے قریب کرتے ہیں، ہماری شخصیت کو نکھارتے ہیں، اور دنیا کی عارضی حیثیت کو سمجھنے میں مدد کرتے ہیں۔ یہ تمثیلات ہمیں ترغیب دیتی ہیں کہ ہم ان کے پیغامات کو اپنی زندگی میں عملی جامہ پہنا کر اپنے کردار اور ایمان کو مضبوط بنائیں۔

اس کتاب میں، ہم نے کوشش کی ہے کہ ان تمثیلات کو تصاویر کے ساتھ اس انداز میں پیش کریں کہ آپ ان کے پیغام کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کر سکیں۔ ہر تصویر، محبت اور محنت سے تخلیق کی گئی، جو آپ کو رکنے، غور کرنے اور حکمتِ الٰہی

سے جڑنے کی دعوت دیتی ہے۔ یہ سفر صرف تصاویر تک محدود نہیں۔ ہر تمثیل کے ساتھ گھرے تبصرے شامل ہیں، جو قرآن پاک، مستند احادیث اور معزز علماء کی حکمت سے اخذ کیے گئے ہیں۔ یہ تبصرے ہر مثال کی پوشیدہ گہرا یوں کو روشن کرتے ہیں، معنی کی ان تھوں کو سامنے لاتے ہیں جو شاید پہلے ہماری نظر وہ سے او جھل تھیں۔

جب آپ اس کتاب کا مطالعہ کریں، تو رک کر سوچیں: یہ تمثیلات ہمیں کیا سکھا رہی ہیں؟ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے ہمیں کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟ یہ کیسے ہماری سوچ، فکر، رویوں اور زندگی میں ثابت تبدیلی لاسکتی ہیں؟

میری دلی خواہش اور دعا ہے کہ یہ کتاب آپ کے روحانی سفر میں ایک مخلص ساتھی بنے، اور آپ کو قرآن پاک پر غور و فکر کرنے، اس کی حکمت کو سمجھنے اور اس کی تعلیمات کو اپنی زندگی میں عملی طور پر نافذ کرنے میں مددگار ثابت ہو۔ آمین یا رب العالمین۔

خلوصِ دل کے ساتھ،

سچل محمد

فہرست

| | |
|----------|------------------------------|
| 11 | تعارف |
| 15 | سورۃ البقرۃ |
| 15 | (1) روشنی میں تاریکیاں |
| 19 | (2) طوفانی رات |
| 23 | (3) پتھروں کی مانند |
| 27 | (4) اندھی تقلید |
| 31 | (5) سات سو دانے |
| 35 | (6) چٹیل میدان |
| 39 | (7) ذرخیز باغ |
| 43 | (8) عمر بھر کی کمائی |
| 47 | سورۃ آل عمران |
| 47 | (9) اللہ کی رسی |
| 51 | سورۃ الانعام |

| | |
|----------|---------------------------------|
| 51 | نور و ظلمات (10) |
| 55 | سورۃ الاعراف |
| 55 | نَفْسٌ لَا تَشَبَّعُ (11) |
| 59 | بَلْ هُمْ أَضَلُّ (12) |
| 63 | سورۃ التوبۃ |
| 63 | کھو کھلی بنیاد (13) |
| 67 | سورۃ یونس |
| 67 | دھوکے کا سامان (14) |
| 71 | زندگی کی کشتی (15) |
| 75 | سورۃ ھود |
| 75 | دل کے اندھے (16) |
| 79 | سورۃ المرعد |
| 79 | تیر بے ہدف (17) |
| 83 | حق و باطل (18) |
| 87 | سورۃ ابراہیم |

| | |
|-----------|---------------------------------------|
| 87 | راکھ کا ڈھیر (19) |
| 91 | شجرۃ طیبۃ (20) |
| 95 | شجرۃ خبیثۃ (21) |
| 99 | سورۃ النحل |
| 99 | مالک اور غلام (22) |
| 103 | گونگا اور داعی (23) |
| 107 | دیوانی عورت (24) |
| 111 | سورۃ الحج |
| 111 | شرک کا انعام۔ زلت اور پستی (25) |
| 115 | طالب و مطلوب (26) |
| 119 | سورۃ النور |
| 119 | روشن چراغ (27) |
| 123 | سراب (28) |
| 125 | اندھیر وں پہ اندھیرے (29) |
| 129 | سورۃ العنكبوت |

| | |
|-----------|----------------------------|
| 129 | مکڑی کا جالم (30) |
| 133 | سورۃ المروم |
| 133 | برابر کے شریک؟ (31) |
| 137 | سورۃ انز مر |
| 137 | طاغوت (32) |
| 141 | سورۃ الحجرات |
| 141 | غیبت (33) |
| 145 | سورۃ الحدید |
| 145 | فریب کاسنفر (34) |
| 149 | سورۃ الحشر |
| 149 | قرآن کی تاثیر (35) |
| 153 | سورۃ الجمیعہ |
| 153 | بدترین مثال (36) |
| 157 | سورۃ الاتحریم |
| 157 | ماحول اور ایمان (37) |

تعارف

قرآن مجید رہتی دنیا تک تمام انسانیت کے لیے ہدایت اور رہنمائی کا زریعہ ہے۔ مشعل راہ ہے اور زندگی گزارنے کا بہترین فور مولا بھی۔ اور قرآن کا پہلا ٹیپر، اس کو سکھانے اور سمجھانے والا خود اللہ سبحان و تعالیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

الْرَّحْمَنُ - عَلَّمَ الْقُرْءَانَ

(اللہ جو) نہایت مہربان ہے۔ (اسی نے) قرآن سکھایا۔ (سورۃ الرحمٰن: 2-1)

ایک اچھے اور مہربان استاد کی بھی نشانی ہوتی ہے کہ وہ اپنے طلباء کو ہر طریقے سے بات سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ بار بار، ہر پہلو سے، کبھی پیار سے تو کبھی ڈاٹ کر، کبھی ماضی کی ناکامیوں کی داستانیں سن کر عبرت دلاتا ہے اور کبھی اعلیٰ تمغات حاصل کرنے والے طلباء کی کہانیاں سن کر اپنے سامعین کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ کبھی امتحان میں فیل ہونے سے ڈرata ہے اور کبھی بہترین مستقبل کی امید دلاتا ہے۔ ایک اور طریقہ کارجو ہر اچھا استعمال کرتا ہے وہ ہے بات کو مثالوں سے سمجھانا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن میں ہر طرح کی واضح مثالوں سے ہمیں بات سمجھانے کی کوشش کی ہے تاکہ انسان کسی طرح اپنی غفلت سے نکل کر اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت کو پالے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَذَا الْقُرْءَانِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ عَلَى جَدَلٍ

اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں (کے سمجھانے) کے لئے طرح طرح کی مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ مگر انسان بڑا ہی جھگڑا الواقع ہوا ہے۔ (سورۃ الکھف: 54)

مثلاً کا مطلب کسی چیز کا کسی دوسرا شے کی شکل و صورت اختیار کر لینا، کسی ایک بات کو دوسرا سے تشبیہ دینا، کسی خیال یا سوچ کی تصویر کشی کرنا، abstract idea کو کسی ایسے نمونے میں پیش کرنا کہ بات واضح ہو سکے، کسی مبہم خیال کو ظاہر کی شکل دے کر واضح کرنا۔ اللہ سبحان و تعالیٰ نے قرآن میں مثالیں اسی لیے دیں کہ انسان ان مثالوں کو سمجھے، غور و فکر کرے، نصیحت اور سبق حاصل کرے۔

وَيَضْرِبُ اللَّهُ أَلَاَمَثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ

یہ مثالیں اللہ اس لیے دیتا ہے کہ لوگ ان سے سبق لیں (سورۃ ابراہیم: 25)

پھر ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَصْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ

اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے اس لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور و فکر کریں۔ (سورۃ الحشر: 21)

اسی طرح سورۃ زمر میں فرمایا:

وَلَقَدْ ضَرَبَنَا لِلنَّاسِ فِي هَذَا الْقُرْءَانِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ

اور ہم نے لوگوں کے (سمجھانے کے) لئے اس قرآن میں ہر طرح کی مثالیں بیان کی ہیں تاکہ وہ نصیحت کپڑیں (سورۃ الزمر: 27)

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ مثالیں اس لیے بیان فرمائیں تاکہ ان کو پڑھ کر انسان کے اندر گہری سوچ، غور اور فکر بیدار ہو سکے۔ ہم میں سے اکثر لوگ ساری زندگی قرآن کی تلاوت کرتے رہتے ہیں لیکن کبھی بھی اس کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ صرف پڑھ لینے سے قرآن کا حق ادا نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ نے صرف علماء کرام کو نہیں بلکہ ہر مسلمان کو دعوت دی ہے کہ اس قرآن کی آیات کو سمجھا جائے اور اس کی آیات پر گہرا تدبیر کیا جائے۔

أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْءَانَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا

کیا یہ لوگ قرآن پر تدبیر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑھ کے ہیں (سورۃ محمد: 24)

تدبر کا لفظ در سے آیا ہے جس کا مطلب پشت یا کمر ہے۔ یعنی آیات کو پڑھ کر انسان سوچے کہ اس کے پیچھے کیا مقصد ہے، غور و فکر کرے کہ آخر اللہ تعالیٰ اس آیت، اس مثال کے زریعے ہمیں کیا سمجھانا چاہتا ہے، اس آیت کے پیچھے کیا حکمت پھی ہے، اس آیت سے ہمیں کیا ہدایت مل سکتی ہے؟

اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ مثال کے لیے ضرب کا لفظ استعمال فرمایا ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا۔ ضرب کا مطلب چوٹ لگانا یا ایک چیز کو دوسرا چیز پر مارنا ہے، جیسے لوہا رجوب لوہے کو چوٹ لگاتا ہے تو اس کا مقصد لوہے کی شکل بد لانا ہوتا ہے۔ اسی طرح ان مثالوں کا مقصد انسان کی فکر پر چوٹ لگا کر اس کی سوچ میں تبدیلی پیدا کرنا ہے، اس کا نظریہ حیات کوئی شکل دینا ہے۔

شیخ شنقطیلی رحمہ اللہ نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مثالیں اور تمثیلیں لوگوں کے صحیح حاصل کرنے کے لیے بیان کی ہیں، اور صرف اہل علم ہی ان کے معنی کو سمجھ سکتے ہیں“

اللہ تعالیٰ نے سورۃ العنكبوت میں فرمایا:

وَتِلْكَ الْأُمَّالُ مُثَلٌ نَضْرٍ بِهَا لِلنَّاسِ ۖ وَمَا يَعْقِلُهُمَا إِلَّا الْعَالَمُونَ

اور یہ مثالیں ہم بیان کرتے ہیں لوگوں کے لیے لیکن انہیں نہیں سمجھتے مگر وہی لوگ جو علم والے ہیں
(سورۃ العنكبوت: 43)

شیخ ابو اسحاق الحوینی کہتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ نے قرآن میں متعدد بار تمثیلیں بیان کی ہیں، اور اس کے پیچھے حکمت یہ ہے کہ اس کی مخلوق، اس کے کلام کو سمجھ سکے۔ لذات قرآن میں تمثیلیں بیان کرنے کی وجہ کسی خیال یا تصور کو واضح کرنا ہے جو ذہن کے لیے بہم (غیر واضح) ہو۔ پس جو تمثیل کو سمجھنے سے قاصر ہوا سے اپنے لیے رونا چاہیے“

شیخ السعدی رحمہ اللہ نے کہا:

”اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس نے انسانوں کے لیے قرآن میں مثالیں بیان کی ہیں تاکہ وہ اس کی آیات پر غور کریں۔ درحقیقت یہی غور و فکر کرنے سے بندے کے علم کے خزانے کھل جائیں گے، اسے نیکی اور بدی کے راستے میں فرق نظر آنے لگے گا، اسے اچھے اخلاق اور اعلیٰ کردار کی ترغیب ملے گی اور وہ برے اخلاق سے دور ہو جائے گا۔ بندے کے لیے قرآن کی آیات پر غور کرنے اور اس کے معانی پر غور کرنے سے بڑھ کر کوئی چیز فائدہ مند نہیں“

ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ

”بعض سلف کو جب کوئی مثال سمجھ نہیں آتی تھی تو وہ روایا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ سمجھنے تھے سخت دل لوگ مثالوں کو نہیں سمجھ سکتے چاہے وہ کتنی ہی واضح کیوں نہ ہوں“

اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحِي أَن يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعْوَذَةً فَمَا فَوْقَهَا فَأَمَّا الَّذِينَ عَامَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا لَفِي قَوْلِهِنَّ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهِلْذَا مَثَلًا يُضَلُّ بِهِ كَثِيرٌ وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرٌ وَمَا يُضَلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ

اللہ اس سے ہر گز نہیں شر ماتا کہ مجھریاں سے بھی حقیر تر کسی چیز کی تمثیلیں دے۔ جو لوگ حق بات قبول کرنے والے ہیں، وہ انہی تمثیلیوں کو دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ یہ حق ہے، جو ان کے رب کی طرف سے آیا ہے اور جو کفر کرنے والے ہیں، وہ انہیں سن کر کہنے لگتے ہیں کہ ایسی مثال سے اللہ کی کیا مراد ہے؟ اسی طرح اللہ ایک ہی بات سے (یعنی ان مثالوں سے) بہتوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے، اور بہتوں کو راست دکھادیتا ہے
(سورۃ البقرۃ: 26)

ان آیات اور علاما کرام کے اقوال سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان تماشیل کے لحاظ سے انسانوں کو دو طرح کے لوگوں میں تقسیم کیا:

- ۱۔ ایک وہ جوان مثالوں پر غور و فکر کر کے انہیں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں یہ لوگ اللہ کی نظر میں علم والے ہیں
- ۲۔ دوسرے وہ جوان مثالوں پر سوال اٹھاتے ہیں، سوچ سمجھے بغیر انہیں مسترد کر دیتے ہیں اور انہیں مثالوں کی وجہ سے گمراہ ہو جاتے ہیں

اس کتاب کا مقصد ان مثالوں کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں، تصاویر کے زریعے سمجھنے کی ایک چھوٹی سی کوشش ہے۔ تاکہ ہم ان مثالوں پر تذہب اور غور و فکر کر کے اپنی زندگی میں ان مثالوں کی relevance اور اہمیت کو سمجھ سکیں، ان سے سبق حاصل کر سکیں اور اپنی زندگی کو ان کے مطابق بدل سکیں۔ کیونکہ ان تمثیلیوں کو سمجھنا انسان کو اہل کمال اور اہل علم کی صفت میں شامل کر سکتا ہے اور ان کا نہ سمجھنا عیوب اور گمراہی کی وجہ بن سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری اس کوشش کو قبول فرمائے اور ہمارے سینوں کو اپنے قرآن کے علم سے روشن اور منور فرمادے۔

سورة البقرة

روشنی میں تاریکیاں



مَثْلُهُمْ كَثِيلٌ الَّذِي أَسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا آتَاهُمْ أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ
اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلْمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ۔ صُمْمُ بُكْمُ عُمْيٌ
فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ

ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی اور جب اُس نے سارے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کا نور بصارت سلب کر لیا اور انہیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ تاریکیوں میں انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ (یہ) بہرے ہیں، گونے ہیں، اندھے ہیں کہ (کسی طرح سیدھے رستے کی طرف) لوٹ ہی نہیں سکتے

(سورة البقرة: 17-18)

اس آیت میں اللہ سبحان و تعالیٰ مثال دیتے ہیں کہ صحر اہے، گھری تاریکی ہے اور ایسے اندھیروں میں کچھ لوگ رستہ بھٹک گئے ہیں۔ ایسے میں انہی میں سے ایک شخص آگ جلاتا ہے، تاکہ روشنی ہو سکے اور لوگوں کو رستہ نظر آئے۔ لیکن جیسے ہی ماحول روشن ہوتا ہے اللہ ان میں سے کچھ لوگوں کا نور بصارت سلب کر دیتا ہے، اب ماحول تو روشن ہے لیکن یہ لوگ اس نور سے فائدہ اٹھانے سے قاصر ہیں۔ روشنی کے باوجود یہ لوگ اپنے اندھیروں میں بھکتے رہتے ہیں۔

یہ مثال ان کافروں اور مشرکین مکہ کی ہے جو نبی پاک ﷺ کے آنے سے پہلے گمراہی کے اندھیروں میں بھٹک رہے تھے۔ پھر نبی پاک ﷺ نے اگر قرآن اور ہدایت کا نور روشن کیا تاکہ لوگوں کو صحیح راستے کی طرف ہدایت ملے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی مثال آگ کی روشنی سے دی کہ جیسے آگ جلاتے ہی ماحول روشن ہو جاتا ہے اور ارد گرد کی تمام چیزیں صاف نظر آنے لگتی ہیں، بھٹک ہوئے لوگوں کو راستہ مل جاتا ہے بالکل ویسے ہی ہدایت ملنے کے بعد دنیا اور آخرت کی تمام حقیقت انسان پر واضح ہو جاتی ہے، اور گمراہی اور کفر کے اندھیروں میں بھکتے ہوئے لوگوں کو اللہ تک پہنچنے کی راہ مل جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بارہ قرآن کو نور کہا:

فَعَامِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالنُّورِ الَّذِي أَنْزَلَنَا

پس ایمان لاو اللہ پر، اور اس کے رسول پر، اور اس روشنی (یعنی قرآن) پر جو ہم نے نازل کی ہے
(سورۃ النغاب: 8)

لیکن ان کافروں اور مشرکین نے اس نور سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اس کا صاف انکار کر دیا۔ اب نور تو تھا، ہدایت بھی تھی لیکن یہ لوگ دل کے اندر ہے اور اسی وجہ سے یہ اس روشنی سے فائدہ نہ اٹھا سکے اور اپنی روح کی تاریکیوں میں بھکتے رہے۔

فَإِنَّهَا لَا تَعْمَلُ الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَلُ الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ

حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندر ہے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔ (سورۃ الحج: 46)

اس مثال میں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ ارجمن اور رحیم ہے وہ کسی کا نور بصارت اس وقت تک سلب نہیں کرتا جب تک کوئی انسان مسلسل روشنی کا انکار نہ کرے، کفر، نفاق اور اللہ کی تاریخی پر حجم ناجائے۔ نور ہونے کے باوجود اندھیروں میں رہنا پسند کرے۔

أَمْ أَبْرَمْوْلَ أَمْرِاً فَإِنَّا مُبِرِّمُونَ

کیا انہوں نے کوئی قطعی فیصلہ کر لیا ہے؟ تو پھر ہم بھی ایک قطعی فیصلہ کیے لیتے ہیں (سورۃ الزخرف: 79)

یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لیے اپنے رسول بھیجے، اپنی کتابیں بھیجیں۔ لیکن اگر لوگ ہدایت کی روشنی کی طرف جانے کے بجائے کفر کے اندر ہمروں میں بھکتی رہنے کا قطعی فیصلہ کر لیں تبھی اللہ سبحان و تعالیٰ بھی ان کی گمراہی اور تباہی کا فیصلہ فرمادیتے ہیں۔

اور جو قوم شہود تھی ان کو ہم نے ہدایت کی راہ دکھائی مگر انہوں نے راستہ دیکھنے کے بجائے اندر ہاٹا رہنا ہی پسند کیا، آخر ان کے کرتوقتوں کی بدولت ذات کا عذاب ان پر ٹوٹ پڑا (سورۃ فصلت: 17)

نبی پاک ﷺ جو قرآن اور ہدایت کی روشنی اپنے ساتھ لے کر آئے تھے وہ سب کے لیے ہدایت بن سکتی تھی، ہر کسی کے لیے اسلام قبول کرنے کی کھلی دعوت تھی۔ جن لوگوں نے اس دعوت کو قبول کیا انہوں نے اس نور کی مدد سے صراط مستقیم کو پالیا اور اس را پر چلتے ہوئے جنت تک پہنچ گئے۔ لیکن جنہوں نے اس کا انکار کیا وہ اندر ہمروں میں بھکتی رہے یہاں تک کہ وہ جہنم کے گڑھے میں جا گئے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

میری اور لوگوں کی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جس نے آگ جلائی، جب اس کے چاروں طرف روشنی ہو گئی تو پردازے اور یہ کیڑے مکوڑے جو آگ پر گرتے ہیں اس میں گرنے لگے اور آگ جلانے والا انہیں اس میں سے نکالنے لگا لیکن وہ اس کے قابو میں نہیں آئے اور آگ میں گرتے رہے۔ اسی طرح میں تمہاری کمر کو پکڑ کر آگ سے تمہیں نکالتا ہوں اور تم ہو کہ اسی میں گرتے جاتے ہو۔ (صحیح بخاری: 6483)

ہمارے لیے اس مثال میں یہ پیغام ہے کہ مکہ کے تاریک صحرا میں قرآن کی جو روشنی نبی پاک ﷺ نے ۱۳۰۰ سال پہلے جلائی تھی وہ آج بھی ہمارے درمیان موجود ہے۔ جب ایک بچہ مسلمان گھر میں پیدا ہوتا ہے تو اس کے ارد گرد یہ روشنی ہوتی ہے لیکن اسے قبول کرنا اور اس سے فائدہ اٹھانا ہر شخص کا اپنا ذاتی فیصلہ ہے۔ جب کوئی اس روشنی کا انکار کرتا ہے، ایک لمبے عرصے تک قرآن اور ہدایت سے منز موڑ لیتا ہے، اللہ کی نافرمانی اور گناہوں میں پڑا رہتا ہے تو عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا نور بصارت چھین لیں اور اسے اس کی تاریکیوں میں بھکتنے کے لیے چھوڑ دیں۔

إِنَّا هَدَيْنَاكُمُ الْسَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرِينَ وَإِمَّا كَفُورًا

ہم نے اُسے راستہ دکھادیا، اب چاہے وہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا (سورۃ الانسان: 3)

طوفانی رات



أَوْ كَصَبِّيْتُ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلْمَتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ
 أَصَبِّعُهُمْ فِيءَ اذَا نِهَمْ مِنَ الصَّوْعِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللهُ مُحِيطٌ
 بِالْكَافِرِينَ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطُفُ أَبْصَارَهُمْ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا
 فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا وَلَوْ شَاءَ اللهُ لَذَاهَبٌ بِسَمْعِهِمْ
 وَأَبْصَرٌ هُمْ إِنَّ اللهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

یا ان کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے بڑے زور کی بارش برس رہی ہے اس میں اندر ہیرے بھی ہیں اور گرج اور بجلی (کی چمک) بھی۔ یہ بجلی کے کٹک سُن کے اپنی جانوں کے خوف سے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں اور اللہ ایسے کافروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ قریب ہے کہ بجلی (کی چمک) ان کی آنکھوں (کی بصارت) کو اچک لے جائے۔ جب بجلی (چمکتی ہے اور) ان پر روشنی ڈالتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں اور جب اندر ہیرا ہو جاتا ہے تو کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے کانوں (کی سماعت) اور آنکھوں (کی بینائی دونوں) کو زائل کر دیتا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے

(سورۃ البقرۃ: 19-20)

سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ ایک طوفانی رات کی مثال دیتے ہیں۔ اندھیرا، بارش اور شدید گرج چمک ہے۔ کچھ لوگ اس طوفانی رات میں خوفزدہ ہیں اور انہوں نے گرج چمک کے ڈر سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس رکھی ہیں۔ اس طوفان میں روشنی اور اندھیروں کے وقٹے ہیں۔ جب بھلی چمکتی ہے اور روشنی نظر آتی ہے تو یہ لوگ کچھ قدم پلٹ پڑتے ہیں اور جب اندھیرا ہوتا ہے تو پھر رک جاتے ہیں۔ یہ لوگ سفر پر تو نکل آئے ہیں لیکن موت کے ڈر کی وجہ سے اس راستے پر آگے بڑھنے کی ہمت نہیں رکھتے۔

بچھلی مثال ایسے کافروں کی تھی جنہوں نے اسلام کی دعوت قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس مثال میں اللہ تعالیٰ، مدینہ کے ان منافقین کی بات کرتے ہیں جو لوگوں کے دیکھا دیکھی اسلام تو لے آئے لیکن ان کی حقیقت یہ تھی کہ وہ حق اور باطل کے بیچ میں معلق تھے، اسلام اور کفر کے درمیان تدبیب کا شکار تھے۔

مُذَبْذِبِينَ بَيْنَ ذَلِكَ لَا إِلَهَ إِلَّا هَوَ لَاءُ وَلَا إِلَهَ إِلَّا هَوَ لَاءُ

کفر و ایمان کے درمیان ڈاؤاڈول ہیں۔ نہ پورے اس طرف ہیں نہ پورے اس طرف (سورۃ النسا: 143)

ان لوگوں نے دنیاوی مفادات کی خاطر اسلام تو قبول کر لیا اور سوچا کہ شاید اس راستے پر چلانا آسان ہو گا لیکن جب سفر شروع کیا تو انہیں یہ راستہ مشکل لگنے لگا۔ اور ان کا حال شدید طوفان میں پھنسنے ہوئے لوگوں جیسا ہو گیا۔ اس مثال میں:

اندھیروں سے مراد ان لوگوں کے اندر موجود نفاق اور گناہوں کے اندھیرے ہیں۔ بارش سے مراد آسمان سے نازل ہونے والا قرآن اور ہدایت ہے، اللہ تعالیٰ نے بارہ قرآن کی مثال بارش سے دی ہے کہ جیسے بارش کا پانی مردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے بالکل ویسے ہی اللہ کا کلام مردہ دلوں کو نئی زندگی بختنا ہے

وَاللَّهُ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً
لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ

اور اللہ ہی نے آسمان سے پانی اتارا پھر اس سے زمین کو مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیا، یقیناً اس میں نشانی ہے
ان لوگوں کے لیے جو سنتے ہوں (سورۃ النحل: 65)

بھلی کی روشنی سے مراد قرآن میں موجود جنت کی بشارت، دل کو سکون اور اطمینان دینے والی آیات اور ایسے احکامات کہ جن پر عمل کرنا ان منافقین کے لیے بھی آسان تھا۔ لیکن بھلی کی ٹڑک اور گرج سے مراد قرآن میں موجود حرام، حلال، قتل، جہاد، اتفاق کے احکامات اور کفر کے نتیجے میں دی گئی جہنم کی دھمکیاں ہیں جو ان منافقین کے لیے ناقابل برداشت تھیں۔ ان کے ایمان کی کمزوری

کی وجہ سے قرآن میں موجود نصیحتیں، پابندیاں، تنبیہات اور برے اعمال کے نتائج یاد دلانے والی آیات ان منافقین پر بھی کی کڑک کی طرح گرتیں اور اور وہ ان کو سن کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے۔

جب امن کا وقت ہوتا اور آسان احکامات نازل ہوتے تو یہ لوگ دین پر چلنا شروع کر دیتے۔ عبد اللہ بن ابی ابن سلوول جو منافقین کا سردار تھا اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے ہر نماز پہلی صاف میں پڑھا کرتا لیکن جیسے ہی مال خرچ کرنے کی یا اللہ کی راہ میں جہاد کی آیات نازل ہوتیں تو یہ لوگ اپنے کانوں میں انگلیاں دے دیتے اور اللہ کی خاطر قربانی دینے کے لیے ایک قدم بھی اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوتے جبکہ صحابہ کرام ہر لمحے سمعنا و اطعنا کی زندگیاں گزارتے تھے (ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی)۔ وہ جانتے تھے کہ کلمہ پڑھنے کا مطلب خود کو مکمل طور پر اللہ کی بندگی میں دینا اور اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی کے تابع کرنا ہے۔ لیکن ان منافقین نے جزوی اطاعت کا طرز عمل اپنار کھاتا۔

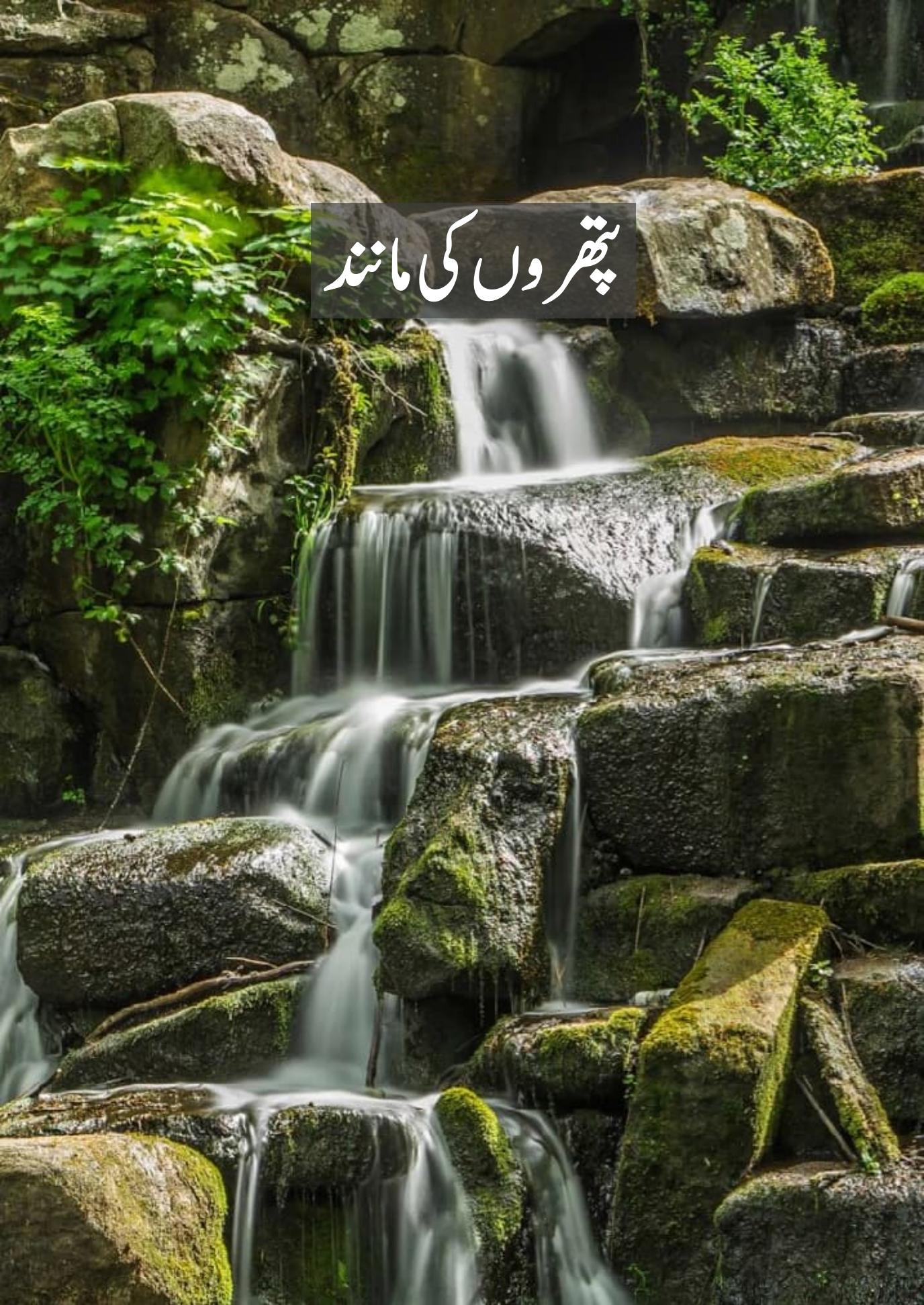
أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكُفِّرُونَ بِبَعْضٍ

تو کیا تم کتاب کے ایک حصہ پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟
(سورۃ البقرۃ: 85)

اب ایک منٹ کے لیے اگر ہم مدینہ کے منافقوں کو بھلا کراپی زندگیوں کا جائزہ لیں تو کیا یہ مثال ہم پر پوری نہیں اترتی۔ جب تک اللہ کا دین آسان اور خوشگوار نظر آتا ہے، اللہ کے احکامات ہماری مرضی اور حالات کے مطابق ہوتے ہیں تو ہم دین کے راستے پر چلتے رہتے ہیں۔ اور جیسے ہی ہمارے سامنے قرآن کی کوئی ایسی آیت آتی ہے، کوئی ایسا حکم آتا ہے جس کے لیے ہمیں تحوڑی سی تنگی یا پریشانی برداشت کرنی پڑے، قربانی دینی پڑے، یا اپنے آرام اور آسائش پر کسی قسم کا سمجھوتہ کرنا پڑے تو ہم بھی اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ ہم بھی مصلحت اور عملی مشکلات کی چادر اوڑھے دین کے راستے پر سہم کر رک جاتے ہیں، اور آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کر پاتے۔ یہ دین اپنی مرضی کا، سہولت اور آسانی کا، جزوی اطاعت کا دین نہیں ہے، کہ جو حکم پسند آیمان لیا اور جس میں مشکل ہوئی چھوڑ دیا۔ دین میں ایسا طریقہ اپنانے والے لوگوں کو اللہ نے اس مثال کے زریعے خبردار کیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو تمہاری سماعت اور بینائی چھین لے تو پھر تم اس را پر چند قدم بھی نہ چل پاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَأَيُّهَا الَّذِينَ إِيمَنُوا أَذْخُلُوا فِي الْسِّلَامِ كَافِةً

اے اہل ایمان! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ (سورۃ البقرۃ: 208)

A photograph of a waterfall flowing over large, moss-covered rocks in a dense forest. The water is clear and flows smoothly over the rocks, creating a misty spray at the base. The surrounding area is filled with green foliage and trees, with sunlight filtering through the leaves.

پھر وہ کی مانند

ثُمَّ قَسْتُ قُلُوبَكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذِلْكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُ قَسْوَةً
وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَلَانَهُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَقَّقُ
فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْبَاءُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ وَمَا أَلَّهُ
بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ

پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس سب کے بعد پس اب تو وہ پتھروں کی مانند ہیں بلکہ سختی میں
ان سے بھی زیادہ شدید ہیں۔ اور پتھروں میں سے تو یقیناً ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے چشمے
پھوٹ پڑتے ہیں۔ اور ان (پتھروں اور چٹانوں) میں سے بیشک ایسے بھی ہوتے ہیں جو شق
ہو جاتے ہیں اور ان میں سے پانی برآمد ہو جاتا ہے۔ اور ان میں سے یقیناً وہ بھی ہوتے ہیں جو
اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ غافل نہیں ہے اس سے کہ جو تم کر رہے ہو۔

(سورۃ البقرۃ: 74)

جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تو ظاہری طور پر تو یہ لوگ بار بار حضرت موسیٰ کے پاس آگر اس حکم کی تفصیلات پوچھتے اور خود کو دین دار ثابت کرتے رہے۔ لیکن جب اللہ کے حکم کی تعمیل کا وقت آیا تو اسے نامانے کے حیلے بہانے بنانے اور چور راستے نکالنے شروع کر دیے۔ یہی بنی اسرائیل کا عام روایہ تھا کہ اتنے مجرزے دیکھنے کے بعد بھی وہ اللہ کے ہر حکم میں فرار کا راستہ ڈھونڈتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے زریعے ان کے دل کی حالت کو ظاہر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارے دل پھر کی طرح سخت ہو گئے یا پھر شاید اس سے بھی سخت، کیونکہ پھر وہ کے لیے تو پھر بھی امید ہوتی ہے۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اور لوگوں میں اللہ سے سب سے زیادہ دور سخت دل والا ہو گا (جامع الترمذی: 2411)

پھر اللہ تعالیٰ نے تین طرح کے پھروں کی مثال بتائی، جو دراصل پھر نہیں بلکہ تین طرح کے دل ہیں:

۱۔ اور پھروں میں سے تو یقیناً ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں: یہاں اللہ تعالیٰ نے پھر کو دل سے اور پانی کو ایمان سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی یہ ایسے لوگوں کے دل ہیں جو حق کو قبول کرنے کے لیے پہلے سے تیار ہوتے ہیں جیسے ہی ان کے لیے ہدایت کے دروازے کھلتے ہیں ان کے دل سے ایمان کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔ یہ فوری طور پر حق کی تصدیق کرتے ہیں اور ایمان کی دولت سے مالا مال ہو جاتے ہیں۔

۲۔ اور ان (پھروں اور چٹاؤں) میں سے بیکار ایسے بھی ہوتے ہیں جو شق ہو جاتے ہیں اور پھر ان میں سے پانی برآمد ہوتا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جو لمبے عرصے تک ہدایت سے دور رہتے ہیں لیکن جب کوئی خاص واقعہ، کوئی سانحہ، کوئی ہلاکتی ہو جبکہ پیش آتا ہے تو اس کے نتیجے میں ان کا دل شق ہو جاتا ہے۔ جب یہ پھر ٹوٹتا ہے، تب اس میں سے پانی نکلتا ہے۔ یعنی جب کوئی واقعہ ان کے دل کو جھبھوڑتا ہے، ان کا دل ٹوٹتا ہے، تب ان کو حق نظر آتا ہے اور تبھی ان کے دل میں ایمان پیدا ہوتا ہے۔

۳۔ اور ان میں سے یقیناً وہ بھی ہوتے ہیں جو اللہ کے خوف سے گرفتار ہے، یہاں پانی کا کوئی ذکر نہیں۔ یعنی اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسلام تولاتے ہیں، اور اللہ کے ڈر سے اللہ کے سامنے جھکتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں، بالکل جیسے پھر اللہ کے خوف سے گرتا ہے یہ لوگ بھی سجدے کرتے ہیں لیکن اللہ کی آیات سن کر ان کا دل نہیں کانپتا، جیسے اس پھر سے پانی نہیں نکلتا ایسے ہی اللہ کا ذکر سن کر ان کی آنکھوں سے آنسو نہیں نکلتے کیونکہ ایمان ابھی ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا ایمان والوں کے بارے میں ارشاد ہے:

حقیقی مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں اور جب انہیں اس کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے رب ہی پر توکل کرتے ہیں (سورۃ الانفال: 2)

اس تمثیل میں بنی اسرائیل کی مثال دے کر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خبردار کیا ہے کہ جب کسی قوم پر کتاب نازل ہونے کے بعد ایک طویل عرصہ گزر جاتا ہے تو ان کے دلوں میں اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت کی قدر و قیمت ختم ہو جاتی ہے۔ ظاہری طور پر وہ دین پر عمل پیرا نظر آتے ہیں، لیکن وقت کے ساتھ عبادت صرف عادت بن جاتی ہے۔ اللہ کا ذکر سن کر ان کے دلوں میں کوئی لرزش پیدا نہیں ہوتی۔ جب اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے، تو وہ حیلے بہانے ڈھونڈنا شروع کر دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں ان کے دل پتھر کی طرح سخت ہو جاتے ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ اللہ تعالیٰ سورۃ حمد میں مسلمانوں کو خبردار کرتے ہیں:

اور (مسلمان کہیں) ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی، توجہ ان پر ایک طویل مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے (سورۃ الحمد: 16)

اس مثال میں ہمارے لیے عبرت بھی ہے اور امید بھی کہ غفلت کے باعث جو دل پتھروں کی مانند ہو چکے ہیں، تو پتھروں میں بھی کچھ ایسے ہیں جن سے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔ اگر آج ہمارے دل سخت ہو گئے ہیں، ہم اللہ کی نافرمانی اور گناہوں میں بہت آگے نکل گئے ہیں، اللہ کا ذکر اور قرآن کی آیات ہمارے دل پر کوئی اثر نہیں کرتیں تو اس مثال میں ہمارے لیے امید کی روشنی ہے کہ اگر پتھر پٹھ سکتے ہیں اور ان میں سے چشمے نکل سکتے ہیں تو انسان کا دل کیوں نہیں پھٹل سکتا۔ پس اللہ کے ذکر اور قرآن کے تذمر میں ہی دلوں کی سختی کا حقیقی علاج ہے اور یہی وہ نور ہے جو دلوں کو زندگی بخش سکتا ہے، چاہے وہ کتنے ہی سخت کیوں نہ ہو چکے ہوں۔

اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَبِّهًًا مَّثَانِي تَقْشِيرٌ مِّنْهُ جُلُودُ الظِّلِّينَ
يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ

اللہ نے بہترین کلام اتنا را ہے، ایک ایسی کتاب جس کے تمام اجزاء ہم رنگ ہیں اور جس میں بار بار مضامین دہراتے گئے ہیں۔ اسے سن کر ان لوگوں کے رو گلکے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرانے والے ہیں، اور پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ (سورۃ الزمر: 23)

اندھی تقلید



وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً
وَنَدَاءً صَمْمٌ بُكْمٌ عُمُّ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ

اور ان لوگوں کی مثال جنہوں نے کفر کیا ایسی ہے جیسے کوئی شخص (جانوروں کے پیچھے) چلا رہا ہو۔ لیکن وہ (جانور) ہانک پکار کی صدا کے سوا کچھ نہیں سنتے۔ وہ بہرے بھی ہیں گو نگے بھی ہیں اندھے بھی ہیں پس وہ عقل سے کام نہیں لیتے (سورۃ البقرۃ: 171)



اللہ سبحان و تعالیٰ مویشیوں کے ایک رویڑ کی مثال دیتے ہیں جو چرواحے کے پیچھے چل رہا ہے۔ چرواحوں نے اپنے رویڑ کو چلانے کے لیے کچھ خاص آوازیں بنائی ہوتی ہیں جن سے وہ اپنے مویشیوں کو ہاتنے اور پکارتے ہیں۔ یہ جانور اپنے چرواحے کی اس ہاتک پکار کو پہچانتے ہیں اور اس کے علاوہ کسی قسم کی دوسرا زبان نہیں سمجھتے۔ اب اگر یہ چرواحا اپنے مویشیوں کو پہلا کی چوٹی پر لے جائے اور وہاں سے انہیں اندھی کھائی میں پھینکنے کا رادہ رکھتا ہو تب بھی یہ جانور اس کے پیچھے ہی چلتے رہیں گے۔ ایسے میں اگر کوئی شخص ان جانوروں کو روکنے کی کوشش کرے، انہیں سمجھائے کہ آگے خطرہ ہے، یہ چرواحا تمہیں مارنا چاہتا ہے پھر بھی یہ جانور چرواحے کی ہاتک پکار پر چلتے رہیں گے کیونکہ یہ کوئی اور زبان سمجھنے کی صلاحیت، ہی نہیں رکھتے۔

یہی مثال مشرکین مکد کی تھی کہ وہ بھی مویشیوں کی طرح اپنے ابا و اجداد کی اندھی تقیید میں پڑے ہوئے تھے۔ باپ دادا نے شرک سکھایا تو وہ اسی کو حق سمجھ کر اپنے ابا و اجداد کی ہاتک پکار کے پیچھے لگے رہے۔ جانوروں کو تو اللہ تعالیٰ نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں دی لیکن یہ لوگ عقل ہونے کے باوجود اپنا اچھا برا سمجھنے سے قاصر تھے۔

إِنْ هُمْ إِلَّا كَلَّا نَعَمِ ۖ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَيِّلًا

یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے (سورۃ الفرقان: 44)

نبی پاک ﷺ آئے ان لوگوں کو سمجھایا، روکا کہ جن ابا و اجداد کی پیروی میں تم لگے ہوئے ہو یہ تمہیں جہنم کی گھری کھائی میں گرا دیں گے لیکن یہ لوگ اپنے باپ دادا کی اندھی تقیید کے سوا کوئی اور بات سمجھنے کے لیے راضی نہیں تھے۔

آج بھی اگر ہم دیکھیں تو کتنے لوگ ہیں جو اپنے والدین کی اندھی تقیید میں لگے ہوئے ہی۔ جب آنکھ کھولی تو والدین کو شرک کرتے دیکھا، بداعت میں میں ملوث، مزاروں پر جاتے اور پیر فقیروں کے پیچھے چلتے پایا، حرام کھاتے اور حرام پہنچتے دیکھا اور پھر ساری زندگی اپنی کے پیچھے چلتے رہے۔ کبھی بھی اپنی عقل و فہم کا استعمال کرتے ہوئے یہ سوال نہیں کیا کہ آیا ہمارے والدین کے عقائد، رسم و رواج اور طریقے صحیح ہیں یا وہ گمراہی کا شکار ہیں؟ کیا یہی اصل دین ہے، یا یہ دین حق کی گزاری ہوئی شکل میں ہیں؟

ان سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کئے ہیں ان کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اچھا اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کچھ کام نہ لیا ہو اور راہ راست نہ پائی ہو تو کیا پھر بھی یہ اپنی کی پیروی کئے چلے جائیں گے (سورۃ البقرۃ: 170)

ہر ذی شعور انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی آنکھیں کھولے، قرآن و سنت کا علم حاصل کرے، حق اور جھوٹ کا فرق سمجھے اور پھر خود اپنی عقل اور سوچ سے فیصلہ کرے کہ کیا اس کے والدین کا مسلک، عقیدہ، عمل اور روایات قرآن اور سنت کے مطابق ہیں؟ اگر تو وہ حق پر ہیں تو ان کے عقیدے کی پیروی کرے ورنہ ان کی پیروی کرنے کے بجائے اپنے والدین کی اصلاح کرنے کی کوشش کرے۔

جیسے حضرت ابراہیم نے اپنے والد سے کہا:

اباجان! میرے پاس ایک ایسا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا، آپ میرے پیچھے چلیں، میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا (سورۃ مریم: 43)

ماں باپ کی اندھی تقليد، انسان کو ایسی گمراہی میں ڈال دیتی ہے جس سے نکنا آسان نہیں ہوتا، اور اس کے ساتھ اس کی نسلیں بھی اسی اندھیرے میں بھکرتی رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم پر نبی اور رسول سمجھے، لیکن یہی اندھی روایت پرستی اور پیروی کی وجہ سے انہوں نے اپنے نبیوں کا انکار کیا اور حق کو رد کر دیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اور (اے نبی ﷺ!) اسی طرح ہم نے آپ سے پہلے جس بیتی میں بھی کوئی خبردار کرنے والا بھیجا اس کے خوشحال لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ایک راستہ پر پایا ہے اور اب ہم ان ہی کے نقشِ قدم کی پیروی کر رہے ہیں (سورۃ الزخرف: 23)

حالانکہ حق تو یہ ہے کہ روز قیامت انسان اکیلا ہو گا، نہ تو والدین کام آئیں گے اور نہ ہی اولاد۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بتاتے ہیں کی وہی انسان جس نے ساری عمر اپنے باپ دادا کی پیروی کی، اس دن خود ان کے خلاف گواہی دیگا:

یا تم (روز محشر) یہ کہو کہ شرک تو پہلے ہمارے آباء و اجداد نے کیا تھا اور ہم ان کے بعد ان کی نسل میں سے تھے تو (اے پروردگار!) کیا تو ہمیں ان باطل پسند لوگوں کے فعل کے بدالے میں ہلاک کرے گا؟ (الاعراف: 173)

انسان کو یاد رکھنا چاہیے کہ قیامت کے دن کوئی رشتہ، کوئی تعلق اسے بچانیں سکے گا۔ وہی اندھی تقليد ہے زندگی میں نجات کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، اُس دن بوجھ بن جائے گی۔ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہو گا، اور اگر انسان نے ساری زندگی حق کو پہچانے کے بجائے روایات کی اندھی پیروی کی، تو وہی تقليد اسے ہلاکت کی گہرائیوں میں دھکیل دے گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی آنکھیں کھولے، سچائی کو سمجھے، اور حق کے راستے کو اپنانے، ورنہ اس روشن کا انجام سراسر پچھتاوا ہے۔

A close-up photograph of a golden wheat field in the foreground, with the sun setting in the background, casting a warm glow over the scene.

سات سودانے

مَثْلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثْلٍ حَبَّةٌ أَنْبَتَتْ
سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُبْلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٌ وَاللَّهُ يُضْعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ۔
وَاللَّهُ وَسِعٌ عَلَيْمٌ

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں، ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سودا نے ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہے بڑھا چڑھا کر دے۔ اور اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے

(سورۃ البقرۃ: 261)

جو لوگ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اللہ سبحان و تعالیٰ ان کے اجر کی مثال اس آیت میں گندم کے ایک دانے سے دیتے ہیں۔ جیسے ایک دانہ زمین میں بویا جاتا ہے اور پھر اس سے سات بالیاں نکلتی ہیں، اور ہر بالی میں سودا نے ہوتے ہیں، ویسے ہی جب انسان اپنی نیت کو خالص کر کے اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اسے ایک نیکی کے بدے سات سو گنازیادہ عطا فرماتے ہیں۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا محض ایک عمل نہیں بلکہ ایک روحانی سرمایہ کاری ہے۔ ہر نیکی، چاہے وہ چھوٹی ہو یا بڑی، اللہ کی رحمت سے کئی گناہ بڑھادی جاتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

جب تم میں سے ایک انسان اپنے اسلام کو خالص کر لیتا ہے تو ہر نیکی جو وہ کرتا ہے، وہ گناہ سے لے کر سات سو گناہ تک لکھی جاتی ہے اور ہر برائی جو وہ کرتا ہے، اسے اس کے لیے ایک ہی لکھا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ سے جامالتا ہے (صحیح مسلم: 336)

اکثر بینک مختلف بچت سکیمیں پیش کرتے ہیں، مثلاً اگر آپ اپنا پیسہ جمع کرائیں تو آپ کو پانچ فیصد یادس فیصد منافع دیا جائے گا۔ لیکن سب سے بہترین سکیم اللہ تعالیٰ نے پیش کی ہے۔ اللہ کے ساتھ کاروبار کرنے والے کو سات سو گنازیادہ منافع ملتا ہے۔ اللہ کے ساتھ کاروبار کرنے والا کبھی خسارے میں نہیں رہتا:

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَعِّفُهُ اللَّهُ وَلَهُ أَجْرٌ كَرِيمٌ

کون ہے جو اللہ کو قرض دے؟ اچھا قرض (قرض حسن)، تاکہ اللہ اسے کئی گناہ بڑھا کر واپس دے، اور اس کے لیے بہترین اجر ہے (سورۃ الحدید: 11)

مولانا مودودی کہتے ہیں کہ، ”یہ اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی ہے کہ جب آدمی اللہ کی دی ہوئی دولت کو اسی کی راہ میں خرچ کرتا ہے، تو اللہ اسے اپنے ذمہ قرض قرار دیتے ہیں، بشرطیکہ یہ قرض حسن (اچھا قرض) ہو، حسن کا مطلب ہے کہ یہ خالص نیت سے، بغیر کسی ذاتی مقصد کے دیا جائے۔“ دنیا میں اگر ہم کسی کو قرض دیتے ہیں تو اس پر سود و صول کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، لیکن جب وہی مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے، تو اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ وہ اسے کئی گناہ بڑھا کر، سود سمیت واپس کرے گا۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ جب اللہ کو قرض دینے والی آیت نازل ہوئی اور لوگوں نے نبی ﷺ کی زبان مبارک سے سئی، تو حضرت ابو دحاح النصاری نے پوچھا، ”یا رسول اللہ، کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض طلب فرماتے ہیں؟“ نبی ﷺ نے جواب دیا، ”ہاں، اے ابو دحاح“ یہ بات سن کر حضرت ابو دحاح نے کہا، ”میں نے اپنے رب کو اپنا باغ قرض میں دے دیا“ حضرت عبد اللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ اس باغ میں 600 کھجور کے درخت تھے، اور وہیں ان کا گھر تھا جہاں ان کے اہل خانہ بھی

رہتے تھے۔ یہ کہہ کر، وہ فوراً گھر پہنچے اور اپنی بیوی کو پکارا، ”ام دحداح، نکل آؤ، میں نے یہ باغ اپنے رب کو قرض دے دیا ہے۔“ بیوی نے جواب دیا، ”تم نے نفع کا سودا کیا، ابو دحداح!“ اور فوراً اپنے سامان اور بچوں کے ساتھ باغ سے نکل گئی۔ (ابن کثیر)

اگر دنیاوی نظر سے دیکھا جائے تو ابو دحداح نے اپنا باغ بھی کھو دیا اور اپنا گھر بھی، پھر یہ نفع کا سودا کیسے ہوا؟ اس سودے میں فائدہ صرف وہ دیکھ سکتا ہے جو اللہ کے وعدوں پر، آخرت کی کامیابیوں پر اور جنت کی خوشخبریوں پر ایمان رکھتا ہو۔ اس دنیا کو آخرت کی کھیتی کہا جاتا ہے اور جو شخص آخرت کا طالب ہے اسے اپنے اندر دو صفات لازمی پیدا کرنی پڑیں گی، توکل اور صبر، بالکل ایک کسان کی طرح جو حق بوتا ہے، سال بھر محنت کرتا ہے، فصل کو پانی دیتا ہے اور اس امید پر صبر کرتا ہے کہ فصل پختہ ہو گی اور وہ اس کا پھل پائے گا۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا کام محنت کرنا ہے لیکن اس محنت میں برکت ڈالنا صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

”مَالِ دَاكِمٍ پَانِي دِينَا، بَهْرَمَهْرَ مِشَكَانٍ پَاوَى
مَالِكِ دَاكِمٍ پَهْلَ بُهْلَ لَانا، لَاوَى يَانَهَ لَاوَى“

اسی طرح نیک عمل کرنا بھی ایک قسم کی کھیتی ہے۔ ہم دنیا میں نیک اعمال کے بیچ بوتے ہیں اور آخرت میں ان کی کامیابی کی امید رکھتے ہیں۔ یہ نیک اعمال دراصل آخرت کے لیے ایک طویل المدت سرمایہ کاری ہیں۔ جیسے کسان اپنی فصل کے پکنے کا انتظار کرتا ہے، اسی طرح ہمیں بھی اپنے نیک اعمال کے نتائج کا صبر اور توکل کے ساتھ انتظار کرنا چاہیے۔

مال اگر اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے تو فائدہ فوراً تو نہیں ملتا لیکن آخرت میں اس کا اجر دائیٰ اور بے انتہا ہو گا۔ اس کے بر عکس اگر مال دنیا میں اپنے آرام و آسائش کے لیے خرچ کیا جائے تو اس کا نتیجہ فوری طور پر تو نظر آ جاتا ہے لیکن اس کا اثر عارضی اور محدود ہوتا ہے۔ بس کسان کی طرح بندہ بھی نیکیوں کے بیچ ڈالتا جائے اور اللہ سے امید رکھے کہ وہ ہماری اس سرمایہ کاری کو ضائع نہیں ہونے دے گا، بلکہ اس کا پھل ایسی صورت میں دے گا جس کا کوئی بدل دنیا میں نہیں مل سکتا۔

إِنَّ الَّذِينَ يَتَلَوَّنَ كَتَبَ اللَّهُ وَأَقَامُوا لِلصَّلَاةِ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقَنَاهُمْ سِرِّاً
وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجْرِيَةً لَّن تَبُورَ

جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے انہیں رزق دیا ہے اس میں سے خفیہ اور اعلانیہ خرچ کرتے ہیں، یقیناً وہ ایک ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جس میں ہر گز خسارہ نہ ہو گا

(سورۃ الفاطر: 29)

چُلپ میدان



فَيَشَّلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابْلُ فَتَرَكَهُ صَلْدَ لَا
يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِّمَّا كَسْبُوا وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِ يَنْ

اس شخص (کے صدقات) کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان ہو جس پر مٹی کی تہہ جبی ہو پھر
اس پر زور دار بارش بر سے اور وہ اسے بالکل صاف اور چھیل چھوڑ دے۔ ایسے لوگ (اپنے
نزدیک خیرات کر کے) جو نیکی کماتے ہیں، اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا، اور اللہ
ایسے ناشکروں کو سیدھی را نہیں دکھاتا۔ (سورۃ البقرۃ: 264)

اللہ تعالیٰ ایک ایسے چٹیل پہاڑ کی مثال دیتے ہیں جس پر مٹی کی ایک تہہ جم گئی ہے۔ انسان جب اس مٹی کی تہہ کو دیکھتا ہے تو اس زرخیز سمجھ کر اس میں کھینچ کر ناشروع کر دیتا ہے۔ اس امید میں کہ جب بارش ہوگی تو یہاں اچھی فصل آئے گی لیکن جب بارش ہوتی ہے تو مٹی کی یہ تہہ پانی کے ریلے میں بہہ جاتی ہے اور پیچھے صرف چٹیل چٹان رہ جاتی ہے۔

یہ ایسے لوگوں کی مثال ہے جو صدقہ خیرات کرنے کے بعد احسان جاتے ہیں، لوگوں کی دل آزاری کرتے ہیں، لعن طعن کرتے ہیں اور تکلیف دہ باتیں کہتے ہیں۔ مٹی کی تہہ ان کی ظاہری نیکی ہے، اور چٹیل پہاڑ ان کے دل کی سختی اور ان کی نیت کی خرابی ہے۔ قدرت کا قانون تو یہ ہے کہ جب بارش پڑتی ہے تو زمین میں جان آجائی ہے، کوپلیں پھوٹ پڑتی ہیں اور کھینچ لہلہانے لگتی ہے۔ لیکن جب بارش قبول کرنے والی زمین ہی سخت اور بخوبی کی کھینچ کو بڑھائے گی لیکن اس بارش نے فائدہ کرنے کے بجائے اللائقان کر دیا۔ ان لوگوں کے صدقے نے انہیں فائدہ پہچانے کے بجائے ان کی اندر کی نیت کو ہر کسی کے سامنے ظاہر کر دیا جیسے مٹی بہہ گئی اور چٹیل میدان پیچھے رہ گیا۔ اب یہ اس کسان کی طرح ہیں جس کا قبضہ بھی گیا اور محنت بھی، یہ لوگ احسان جتا کر اپنا مال بھی ضائع کرتے ہیں اور نیکی بھی ہاتھ نہیں آتی۔

**يَأَيُّهَا الَّذِينَ عَامَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِ وَالْأَذْيَ كَالَّذِي يُنْفِقُ
مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمُ أَكْثَرُ**

اے ایمان لانے والا! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملاو، جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے، نہ آخرت پر (سورۃ البقرۃ: 264)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ احسان جتنے اور دکھ دینے سے بھی ویسے ہی نیکی ضائع ہو جاتی ہے جیسے ریا کاری سے۔ یعنی دو چیزیں ایسی ہیں جو صدقات کے اجر کو صفر کر دیتی ہیں۔ اور بندہ خالی ہاتھ کھڑا رہ جاتا ہے۔

ا۔ ریا کاری کا تعلق نیت کی خرابی سے ہے، یعنی جب کسی شخص نے صدقہ دیا تو اس وقت اس کی نیت میں کھوٹ تھا، اس کا مقصد اللہ کی خوشنودی اور اجر حاصل کرنا نہیں بلکہ اس نے محض دنیا کو دکھانے کے لیے، لوگوں سے تعریفیں حاصل کرنے کے لیے، دنیادی اور سیاسی مفادات کے لیے اور خلق خدا کی خوشنودی کے لیے اپنا مال خرچ کیا۔

۲۔ من وادیٰ کا تعلق کردار کی خرابی سے ہے، یعنی ہو سکتا ہے کہ صدقہ کرتے وقت اس شخص کی نیت خالص تھی لیکن یہ شخص کم طرف نکلا۔ صدقہ تو دے دیا مگر بعد میں اپنے برے رویے، سخت الفاظ، احسان جتلانے اور دکھ دینے کی وجہ سے اس نے اچھی بھلی نیکی کو خاک میں ملا دیا۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا:

جو لوگوں کو ریا کاری کے طور پر دکھانے کے لیے کام کرے گا اللہ قیامت کے دن اس کی ریا کاری کا حال لوگوں کو سنادے گا اور فرمایا کہ جو لوگوں کو تکلیف میں بنتلا کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے تکلیف میں بنتلا کرے گا
(صحیح بخاری: 7512)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسے لوگ نہ تو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر۔ کیونکہ اگر وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے تو وہ خالص اللہ کی خوشنودی کے لیے نیکی کرتے دکھاوے کے لیے نہیں۔ اور اگر آخرت پر ایمان رکھتے تو احسان جتا کہ اپنا صدقہ ضائع نہ کرتے بلکہ اپنی نیکی کا اجر پانے کے لیے آخرت کے دن کا انتظار کرتے۔ تو ایسے لوگوں کا مال بھی گیا اور اجر بھی۔

لَا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ إِمَّا كَسَبُوا لٰ وَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ

ایسے لوگ (خیرات کر کے) جو نیکی کرتے ہیں، اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا، اور اللہ تعالیٰ ایسے نا شکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا (سورۃ البقرۃ: 264)

اس مثال میں ہمارے لیے ایک اہم سبق ہے کہ صدقہ دیتے وقت اپنے دل کی نیت کو ٹھوٹنا بے حد ضروری ہے۔ جب ایک بار خالص نیت سے، صرف اللہ کی رضا کے لیے صدقہ دے دیا جائے، تو پھر اس پر بار بار غور کرنے کی ضرورت نہیں۔ کس کو دیا؟ کب دیا؟ کتنا دیا؟ یہ سب سوالات ذہن سے نکال دیں اور نیکی کو اللہ کے سپرد کر کے آگے بڑھ جائیں۔ وَكَفَى بِاللَّهِ حَسِيبًا (اللہ حساب کرنے کے لیے کافی ہے)۔

پرانے زمانے کی ایک کہاوت ہے، "نیکی کر، دریا میں ڈال"، اور یہی صدقہ کا اصل فلسفہ ہے۔ جب بندے کو یہ پختہ یقین ہو کہ اس نے اپنا مال کسی غریب کے ہاتھ میں نہیں، بلکہ براہ راست اللہ کے حوالے کیا ہے، تو پھر کسی پر احسان جانا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ابن قیم رحمہ اللہ کا قول ہے:

اگر صدقہ دینے والے کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا صدقہ فقراء کے ہاتھوں سے پہلے اللہ کے ہاتھ میں پہنچتا ہے، تو صدقہ دینے کی لذت، لینے والے کی خوشی سے کہیں زیادہ ہو گی

ذرخیزباغ



وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ أَبْيَغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَشْبِيتًا مِنْ
أَنفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبُوَةٍ أَصَابَهَا وَإِلٌ فَعَانَتْ أَكْلَهَا ضِعْفَيْنِ
فَإِنْ لَمْ يُصِبْهَا وَإِلٌ فَطَلٌ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ

بخلاف اس کے جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضا مندی کے لیے دل کے پورے ثبات و
قرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں، ان کے خرچ کی مثال اس باغ کی مانند ہے جو بلندی پر واقع
ہوا ب اگر اس باغ کے اوپر زور دار بارش بر سے تو دو گنا پھل لائے اور اگر زور دار بارش نہ
بھی بر سے تو ہلکی سی پھوار (ہی اس کے لیے کافی ہو جائے) اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ تعالیٰ
اس کو دیکھ رہا ہے (سورۃ البقرۃ: 265)

بچھلی مثال کے بر عکس اس آیت میں اللہ سبحان و تعالیٰ ایسے لوگوں کی بات کرتے ہیں جو خاص اللہ کی رضا و رخشنودی کے لیے اپنا مال خرچ کرتے ہیں، انہیں کسی انسان سے کسی قسم کی شکر گزاری اور بد لے کی امید نہیں ہوتی۔

إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا

(اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ) ہم تو آپ کو صرف اللہ (کی رضا) کے کھلارہ ہیں، ہم آپ سے نہ تو کوئی بد لہ چاہتے ہیں اور نہ ہی شکر گزاری (سورۃ الانسان : 9)

وَتَشَيَّتاً مِنْ أَنفُسِهِمْ کامطلب یہ لوگ جب اللہ کی خاطر صدقہ خیرات کرتے ہیں تو پکے ارادے سے کرتے ہیں، ان کے دل میں کسی قسم کا کوئی ترد کوئی confusion نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی ان لوگوں کو اپنا مال خرچ کرنے کے بعد کسی قسم کا کوئی پچھتاوا ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ صدقہ کرنے کے بعد نہ توجاتے ہیں اور نہ کسی کی دل آزاری کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی مثال ایک ایسے باغ سے دیتے ہیں جو بلند و بالا اور پر فضامقام پر واقع ہے۔ اس کی مٹی اتنی زرخیز ہے کہ اگر زور کی بارش ہو تو یہ باغ دوسرا سے باغوں کی نسبت گناہ پھل دیتا ہے، اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ہلکی پھوار بھی اس باغ کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔

اس مثال میں زرخیز زمین سے مراد انسان کی نیک نیت ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ باغ "بلند" مقام پر ہے یعنی اس شخص کی نیت دنیاوی خواہشات اور ادنیٰ مقاصد سے پاک اور بالاتر ہے۔ اس باغ کی طرح اس شخص کی امید بھی اعلیٰ اور بلند ہے اور صرف اپنے رب سے وابستہ ہے۔ اور بارش سے مراد خیرات ہے، جیسے بارش کھیتی کو زندگی دیتی ہے اور فصل کی نشوونما کرتی ہے ایسے ہی خیرات اور صدقات بھی انسان کی نیکی اور اجر میں اضافہ کرتے ہیں۔ اگر زور کی بارش ہو تو یہ باغ گناہ پھل دیتا ہے اور اگر ہلکی پھوار ہو تو بھی اس کے پھل میں کوئی کمی نہیں آتی۔ یہاں والب (زور کی بارش) سے مراد زیادہ مال خرچ کرنا ہے اور گلل (یعنی ہلکی پھوار) سے مراد تھوڑا مال۔ اللہ تعالیٰ انسان کی نیت اور اخلاص کو دیکھتا ہے مال کی مقدار کو نہیں، اگر انسان کی نیت اچھی ہو تو چاہے وہ زیادہ خرچ کرے یا تھوڑا، اس کا صدقہ ہر حال میں اس کے لیے اجر و ثواب کا باعث بنتا ہے۔

عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے ہر شخص سے اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) بغیر کسی ترجیح کے ہم کلام ہو گا۔ بندہ اپنی دائیں جانب نگاہ ڈالے گا تو اپنے ان اعمال کے سوا جن کو اپنے آگے بھیج چکا تھا کچھ بھی نہ دیکھے گا، پھر با نیکیں جانب نگاہ ڈالے گا تو اپنے ان اعمال کے سوا جن کو آگے بھیج چکا تھا کچھ بھی نہ دیکھے گا، پھر اپنے آگے دیکھے گا تو جہنم اس کے سامنے ہو گی۔ پس جو کھجور کے ایک ٹکڑے کو اللہ کی راہ میں دے کر جہنم سے بچ سکتا ہو، تو اس کو ضرور ایسا کرنا چاہیے۔ (سنن ابن ماجہ: 185)

یعنی نیک نیت سے دیا گیا کھجور کا ایک کٹکڑا بھی انسان کو جہنم کی آگ سے بچا سکتا ہے۔ اللہ سبحان و تعالیٰ نے قرآن میں بار بار یہ بات واضح فرمائی کہ ہر شخص کے اعمال کا فیصلہ اور اجر اس کی استطاعت کے مطابق ہو گا۔

صاحب و سمعت کو اپنی و سمعت کے مطابق خرچ کرنا چاہیے۔ اور جس کے رزق میں تنگی ہو وہ جتنا اللہ نے اس کو دیا ہے اس کے مطابق خرچ کرے۔ اللہ کسی جان کو ذمہ دار نہیں ٹھہراتا مگر اسی قدر جو اس نے اسے دے رکھا ہے۔ عنقریب اللہ تنگی کے بعد آسانی بھی پیدا کر دے گا۔ (سورۃ طلاق: 7)

غزوہ تبوک کے موقع پر جہاں حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم جیسے صاحب استطاعت صحابہ کرام نے ہزاروں دینار اللہ کی راہ میں خرچ کیے، وہیں حضرت ابو عقیل رضی اللہ عنہ جیسے صحابہ بھی موجود تھے، جنہوں نے دون بھر مخت و مزدوری سے ٹھوڑا سا کمایا اور اس میں سے آدھا صاع، یعنی تقریباً ایک کلو گلہ، اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیا۔ جب منافقین نے ان غریب مسلمانوں کا مذاق اڑایا اور طعنے دیے، تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ توبہ میں ان کی قربانی کی عظمت کو واضح کیا اور منافقین کو سخت الفاظ میں تنبیہ فرمائی۔

جدول کی خوشی سے بیکی کرنے والے اہل ایمان پر (ان کے) صدقات کے بارے میں طعنے کئے ہیں، جن کے پاس اپنی محنت و مشقت کے سوا کچھ ہے ہی نہیں (اور وہ اس میں سے بھی خرچ کرتے ہیں) تو وہ (منافقین) ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اللہ ان (منافقین) کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے (سورۃ التوبہ: 79)

ام المؤمنین عائشہ رضی تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”بے شک اللہ تعالیٰ صدقے میں دی گئی ایک کھجور یا ایک لقمہ کی اس طرح پرورش کرتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی اپنی گھوڑی یا اپنے بچے کی پرورش کرتا ہے یہاں تک کہ اس (ایک کھجور صدقے کا اجر) احمد پہاڑ جتنا ہو جاتا ہے۔“ (ابن حابان: 3317)

اس مثال کے زریعے اللہ تعالیٰ ہمیں نصیحت کرتے ہیں کہ کسی بھی نیکی کا سب سے اہم ترین جز، نیت ہے،۔ اگر ہم اپنی نیکیوں اور صدقات میں خلوص نیت پیدا کر لیں، اپنی نیت کو دنیاوی پستیوں سے بالاتر کر کے اللہ کی رضا کے لیے خاص کر لیں تو ایسی نیکیوں کا اثر ہماری دنیا اور آخرت کو زرخیز کر دے گا، بالکل اس باعث کی طرح جس میں صدائہ بھار رہتی ہے، جو سارے اسال پھل دیتا ہے، چاہے تیز بارش ہو یا ہلکی پھوار یہ باعث صدائہ بھرا رہتا ہے۔

عمر بھر کی کمائی



أَيُّوْدُ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيلٍ وَأَغْنَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا أَلَانِهَرٌ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ أَشْبَرٍ تِ وَأَصَابَهُ الْكِبْرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَأَحْتَرَقَتْ كَذِلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ

کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جس کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں اس کے لیے اس باغ میں ہر طرح کے پھل ہوں اور اس پر بڑھا پاطاری ہو جائے جبکہ اس کی اولادا بھی ناتوان ہو اور عین اس وقت اس باغ پر ایک ایسا بگولا پھر جائے جس میں آگ ہو اور وہ باغ جلس کر رہ جائے؟ اس طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیات تمہارے لیے واضح کرتا ہے تاکہ تم غور و فکر کرو۔ (سورۃ البقرۃ: 266)

یہ مثال ایک ایسے شخص کی ہے کہ جس نے ساری عمر لگا کر ایک باغ سمجھا، اس میں ہر طرح کا پودا لگایا، درخت لگائے، پھل لگائے۔ اس باغ میں ندیاں بہتی ہیں جن سے پودے سیراب ہو رہے ہیں۔ اس کی ساری زندگی کی کمائی یہی باغ تھا پھر جب وہ بوڑھا اور ضعیف ہو گیا، ایسے کمزور لمحوں میں جب اسے اس باغ کی کمائی کی سب سے زیادہ ضرورت تھی تو ایک بگولہ آیا جس نے اس باغ کو جلا کر راکھ کر دیا۔ سب کچھ تباہ و بر باد ہو گیا، اب بڑھاپے میں یہ شخص دیوالیہ ہو گیا، اب نہ تو اس کے پاس منے سرے سے کمائی کرنے کی طاقت باقی ہے اور اس کی اولاد بھی کمزور اور ناتوان ہے کہ اپنے باپ کے کسی کام آسکے۔

اس مثال کی تفسیر ہمیں حضرت عمر اور حضرت ابن عباس رضی تعالیٰ عنہما سے ملتی ہے:

عبدید بن عمر سے روایت ہے، انہوں نے کہا: حضرت عمر نے ایک مرتبہ نبی ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دریافت فرمایا کہ تمہارے خیال کے مطابق درج ذیل آیت کس معاملے کے متعلق نازل ہوئی تھی؟ ”کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اس کا ایک باغ ہو۔“ صحابہ کرام نے کہا: ”اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔“ حضرت عمر نے ناراض ہو کر کہا: ”یہ کیا بات ہوئی؟ صاف کہو کہ ہمیں معلوم ہے یا معلوم نہیں۔“ اس وقت حضرت ابن عباس کہنے لگے: ”امیر المؤمنین! میرے دل میں ایک بات آئی ہے۔“ آپ نے فرمایا: ”میرے بھتیجے! بیان کرو اور خود کو حقیر نہ خیال کرو۔“ حضرت ابن عباس نے کہا: ”اس آیت میں عمل کی مثال بیان کی گئی ہے۔“ حضرت عمر نے فرمایا: ”کون سے عمل کی مثال بیان کی گئی ہے؟“ حضرت ابن عباس نے کہا: ”بس عمل کی مثال ہے۔“ اس پر حضرت عمر نے فرمایا: ”یہ ایک مال دار شخص کی مثال ہے جو اللہ کی اطاعت میں عمل کرتا رہتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس پر شیطان کو غالب کر دیتا ہے تو وہ گناہوں میں مصروف ہو جاتا ہے اور اس کے نیک اعمال سب کے سب فنا ہو جاتے ہیں۔“ (صحیح بخاری: 4538)

یہی روایت اس مثال کی پوری تفسیر ہے، اس مثال میں باغ سے مراد اس انسان کی زندگی بھر کی کمائی ہے، اس باغ میں کھجور، انگور اور ہر طرح کے پھل سے مراد اس بندے کی مختلف نیکیاں ہیں۔ اس نے ساری زندگی ہر طرح کے نیک اعمال کیے، سوچ سمجھ کے نیکیوں کے پودے لگائے اور ان کی پرورش کی۔ نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، صدقہ خیرات کیا، بڑی محنت سے اپنی نیکیوں کے باغ کو پرواں چڑھایا۔ اس باغ میں ندیاں بہتی ہیں یعنی اس باغ میں سیرابی کا نظام موجود تھا، ندیوں سے مراد نہ ختم ہونے والے وسائل ہیں۔ یعنی اس شخص کے پاس صحت بھی تھی، پیسہ بھی اور نیکیوں کے بیٹھار موقوع بھی۔ اگر بگولہ نہ آتا تو یہ باغ صد اشاداب رہتا، اس شخص کو نیکیوں کے موقع ملتے رہتے اور یہ مسلسل اپنے باغ کی نشوونما کرتا رہتا۔ لیکن اچانک ایک آگ کا بگولہ آیا اور اس نے سارا باغ اجڑا کے رکھ دیا۔ اس آگ کے بگولے سے مراد شیطان یا پھر خود انسان کے نفس کا حملہ ہے جو اچھے بھلے نیک لوگوں کو سیدھی راہ سے بھٹکا دیتا ہے۔ یہ شخص نیکیاں کرتے کرتے اچانک گناہوں اور بد کا یوں میں پڑ گیا اور اس طرح سارا بنا بنا یا باغ لاکھ کا خاک ہو گیا۔ اب یہ شخص جب اللہ کے پاس پہنچ گا تو اس کا حال اس بڑھے جیسا ہو گا جس کی ساری زندگی کی کمائی ایک ایسے نازک

موقع پر اجر گئی جب اس کمائی کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ اس دن یہ اللہ کے سامنے خالی ہاتھ کھڑا ہو گا، نہ تو نے سرے سے کوئی عمل کرنے کا موقع باقی رہے گا اور نہ ہی اس دن کوئی اولاد کام آسکے گی۔

وَهُمْ يَصْطَرِخُونَ فِيهَا رَبَّنَا أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَلِحًا غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلْ^۱

وہ وہاں جیچ جیچ کر کھیں گے کہ اے ہمارے رب، ہمیں (یہاں سے) نکال لے! اب ہم نیک اعمال کریں گے ان اعمال سے بالکل مختلف جو ہم (پہلے) کیا کرتے تھے (سورہ قاطر: 37)

اس مثال میں ایک نہایت خوفزدہ کردینے والی حقیقت ہے کہ اعمال کا دار و مدار حسن الختمام پر ہے، یعنی یہ ضروری نہیں کہ انسان اپنی زندگی میں کتنا عرصہ نیکیاں کرتا رہا، بلکہ اہم یہ ہے کہ اس کا خاتمه کس حال میں ہو۔ صرف نیکیاں کر لینا کافی نہیں ہے، موت کے وقت تک استقامت سے اللہ کے راستے پر مجھے رہنا اصل challenge ہے۔ انسان ساٹھ سال نیکیاں کرتا رہے اور آخری پانچ سالوں میں شیطان کے ہاتھ چڑھ جائے تو سارا کیا کرایا را کھ ہو جائے گا۔ انسان کبھی بھی شیطان اور اپنے نفس کے حملوں سے محفوظ نہیں ہے۔ اللہ کے راستے پر چلنے والوں کو ساری زندگی اپنے باع کی بڑی چابکدستی سے حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ جو انسان شیطان کے وسوسوں کی حقیقت کو جانتا ہے وہ کبھی لاپرواہی نہیں برتا، وہ کبھی خود کو محفوظ نہیں سمجھتا، وہ ہمیشہ اپنے نفس سے جہاد کی حالت میں زندگی گزارتا ہے کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی سے سارا باع خاک میں مل سکتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ :

بندہ دوزخیوں کے سے کام کرتا رہتا ہے حالانکہ وہ جنتی ہوتا ہے (اسی طرح دوسرا بندہ) جنتیوں کے کام کرتا رہتا ہے حالانکہ وہ دوزخی ہوتا ہے، بلاشبہ اعمال کا دار و مدار خاتمه پر ہے۔ (صحیح بخاری: 6607)

کہا جاتا ہے کہ جب امام احمد کی موت کا وقت آیا تو آپ کہہ رہے تھے ”ابھی نہیں، ابھی نہیں“۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں تو بتایا : شیطان میرے پاس آیا اور وہ کہہ رہا تھا ”اوامد! تم میرے ہاتھ نہیں آئے“ امام احمد نے اس سے کہا ”ابھی نہیں، ابھی نہیں“ یعنی ابھی روح نہیں لٹکی۔ حضرت ابو بکر رضی تعالیٰ عنہ استقامت اور حسن الختمام کے لیے بہت خوبصورت دعا کیا کرتے تھے :

اللَّهُمَّ اجْعَلْ خَيْرَ عُمُرِي آخِرَةً، وَخَيْرَ عَمَلِي خَوَاتِمَةً، وَخَيْرَ أَيَّامِي يَوْمَ الْقَيْمَةِ
اے اللہ! میری زندگی کے آخری حصے کو بہترین حصہ بنادے، میرے آخری اعمال کو میرے بہترین اعمال بنادے
اور میرا بہترین دن وہ ہو جس میں تجھ سے ملوں

سورة آل عمران

اللہ کی رسی



وَأُتْصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّوْلَ وَأَذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ
 عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ^١
 إِخْرَانًا وَكُنْتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذِلِكَ
 يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ إِعْيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهَتِّدُونَ

سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے کپڑا اور تفرقة میں نہ پڑو۔ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے دل جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ اور تم تو آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ گئے تھے (بس اس میں گرنے ہی والے تھے) تو اللہ نے تمہیں اس سے بچالیا اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیات واضح کر رہا ہے تاکہ تم راہ پاؤ (اور صحیح راہ پر قائم رہو) (سورۃ ال عمران: 103)

اس مثال کو سمجھنے کے لیے تصور کریں کہ کچھ لوگ آگ کے ایک گڑھے میں گرنے والے تھے، پھر کسی نے ان کی جان بچانے کے لیے ایک رسی سچینی اور ان سب نے اس رسی کو مظبوطی سے تھام لیتا تاکہ یہ آگ میں گرنے سے نج سکیں۔ اب ان کی زندگی اسی میں ہے کہ وہ سب اس رسی کو ایک ساتھ مظبوطی سے پکڑ کر رکھیں اگر ان میں تفرقة پڑ گیا اور وہ آپس میں لڑنا جگہ ناشروع ہو گئے تو رسی ہاتھ سے چھوٹ جائے گی اور وہ سب کے سب آگ کے گڑھے میں جا پڑیں گے۔

اس مثال میں اللہ کی رسی اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو ہدایت بن کر جو لوگ گمراہی میں پڑے ہوئے تھے، جہنم کے دہانے تک پہنچ گئے تھے انہیں اس ہدایت نے آگ کے گڑھے میں گرنے سے بچالیا۔ ابو شریح الخراشی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

بے شک یہ قرآن ہی اللہ کی رسی ہے۔ جس کا ایک سراللہ کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سر انہمارے ہاتھ میں۔
اگر تم اسے مضبوطی سے تھامے رہو، تو تم پھر کبھی گمراہ یا بر باد نہیں ہو گے۔ (صحیح ابن حبان: 122)

رسول پاک ﷺ کے آنے سے پہلے پورا عرب معاشرہ گمراہی کے اندر ہیروں میں ڈوبا ہوا تھا، ہر قبیلہ دوسرے کا دشمن تھا، لوگوں کے حسب و نسب کو عزت ذات کا معیار سمجھا جاتا تھا، لوگ آپس میں ایک دوسرے کے خون کے پیاس سے تھے، ہر طرف لا قانونیت تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ کتاب نازل کی جس نے لوگوں کی دشمنیوں کو محبت میں بدل دیا۔ قبیلوں کا فرق، امیر غریب کا فرق، گورے کا لے، عربی اجھی، رنگ نسل ہر چیز کا فرق ختم ہو گیا۔ لا الہ الا اللہ کا تعلق خون کے رشتؤں سے بھی مضبوط ہو گیا۔ بس جس نے اللہ کی رسی کو تھام لیا وہ ایک دوسرے کا بھائی بن گیا اور جہنم کی کھائی میں گرنے سے نج گیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ بار بار ہمیں نصیحت فرماتے ہیں کہ قرآن کو مضبوطی سے تھام کر رکھو اور آپس میں فرقوں میں نہ بٹو۔

اور اس نے ان (اہل ایمان) کے دلوں میں الفت پیدا کر دی۔ اگر تم زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر دیتے تو ان کے دلوں میں یہ الفت پیدا نہیں کر سکتے تھے مگر وہ اللہ ہے جس نے ان لوگوں کے دل آپس میں جوڑ دیے یقیناً وہ زبردست ہے حکمت والا ہے (سورۃ الانفال: 63)

آج مسلمانوں کا حال دیکھیں کہ ہم نے اللہ کے اس حکم کو سراسر فراموش کر دیا، آج ایک مسلمان دوسرے کے خون کا پیاسا ہے۔ ایک اللہ، ایک رسول، ایک قرآن، ایک کلمہ ہونے کے باوجود یہ امت ناجانے کتنے فرقوں میں بٹ گئی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ کوئی اپنے مسلک کی پیروی کر رہا ہے، تو کوئی اپنے فرقے کی، کوئی والدین کے عقیدے کے پیچھے چل رہا ہے تو کوئی اپنے پیر صاحب کا مرید ہے۔ لیکن قرآن اور سنت کی پیروی کرنے والے بہت کم ملتے ہیں۔

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو؟ تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟

یہ زوال صرف انفرادی سطح تک محدود نہیں ہے، بلکہ مسلمان ممالک کا حال اس سے بھی بدتر ہے۔ ان کی پالیسیاں اور تنام کو ششیں صرف اپنے ملک کے مفادات کے لیے ہوتی ہیں، نہ کہ امت مسلمہ کے فائدے کے لیے۔ آج کے مسلمان ممالک اپنے معاشی اور سیاسی ترجیحات کے لیے اپنے ہی بہن بھائیوں کے قاتلوں کے ساتھی بن چکے ہیں۔ اقبال نے سچ کہا تھا کہ آج کے دور کا سب سے بڑا شرک "وطن پرستی" ہے:

ان تازہ خداوں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیر ہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کن ہے

اللہ تعالیٰ نے ہمیں فرقہ واریت اور وطن پرستی سے نپختے کا ایک ہی راستہ بتایا، اور وہ یہ کہ ہم اللہ کی رسی یعنی قرآن کو مضبوطی سے تھام لیں۔ مگر افسوس کہ ہم نے قرآن کو چھوڑ کر اپنے اپنے مسلک، فرقہ اور دنیاوی نظریات کو اپنالی۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ انتشار اور زوال کا شکار ہے۔ روز قیامت نبی پاک ﷺ سے ہمارے بارے میں شکوہ کریں گے:

وَقَالَ الْرَّسُولُ يَلَّرَبِ إِنَّ قَوْمِي أَتَخَذُونَ هَلَذَا الْقُرْءَانَ مَهْجُورًا

اور رسول ﷺ کہیں گے کہ اے میرے پروڈگار! بے شک میری امت نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا
(سورۃ الفرقان: 30)

ابھی بھی موقع ہے اگر آج بھی مسلمان آپس کے جھگڑے اور فرقہ واریت چھوڑ کر اللہ کی رسی کو، اس قرآن و سنت کو مل کر تھام لیں تو ہم اس آگ کے گڑھے میں گرنے سے نج سکتے ہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" بلاشبہ اللہ تمہارے لیے تین چیزیں پسند کرتا ہے اور تین ناپسند کرتا ہے، وہ تمہارے لیے پسند کرتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور فرقوں میں نہ بٹو۔ اور وہ تمہارے لیے قیل و قال (فضول باتوں)، کثرت سوال اور مال ضائع کرنے کو ناپسند کرتا ہے" (صحیح مسلم: 4481)

سورة الانعام

نور و ظلمات



أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْسِي بِهِ فِي الْنَّاسِ
كَمَنْ مَثْلُهُ فِي الظُّلْمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا كَذَلِكَ زُرْبَنَ
لِلْكَافِرِ بِئْ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ

کیا وہ شخص جو پہلے مُردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو وہ نور عطا کیا جس کے
اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے اُس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو
تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور کسی طرح ان سے نہ نکلتا ہو؟ کافروں کے لیے تو اسی طرح ان
کے اعمال خوشمنداندیے گئے ہیں۔ (سورۃ الانعام: 122)



اس آیت میں اللہ سبحان و تعالیٰ دو طرح کے لوگوں کا موازنہ کرتے ہیں۔ ایک شخص جو مردہ تھا، یہاں موت سے مراد روحانی موت ہے۔ جس انسان کا دل اللہ کی معرفت اور ہدایت کی روشنی سے خالی ہوتا ہے وہ چاہے جسمانی اعتبار سے زندہ ہو، جیتا جاتا ہو، سانس لے رہا ہو، لیکن اللہ کی نظر میں ایسا شخص مردہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس شخص میں ہدایت کی روح پھوکی اور اس کو نئی زندگی عطا فرمائی، اسے اسلام اور قرآن کا نور بخشا، اور اس شخص کا دل اللہ کی محبت اور ہدایت سے منور ہو گیا۔

**۳۰۷ ﴿۱۱﴾
اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ ءَامَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلْمَاتِ إِلَى النُّورِ**

جو لوگ ایمان لاتے ہیں، ان کا ولی و مددگار اللہ ہے اور وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے۔
(سورۃ البقرۃ: 257)

اس آیت میں لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرنے سے مراد ہے کہ وہ شخص اس روشنی کو اپنی زندگی کے ہر پہلو میں ساتھ لے کر چلتا ہے۔ وہ زندگی کے تمام معاملات میں اللہ کی ہدایت کو اپنا رہنمایا بنتا ہے، چاہے وہ معاشرتی تعلقات ہوں یا دنیاوی فرائض۔ جس شخص کو اللہ نے ہدایت عطا کر دی وہ لوگوں سے قطع تعلق کر کے جنگلوں کی طرف نہیں نکل جاتا ہے، خود کو کمرے میں بند کر کے چوبیں گھٹنے اللہ کی عبادت میں مگن رہتا ہے، بلکہ وہ دنیا میں رہ کر اللہ کو یاد رکھتا ہے، لوگوں سے ملتا ہے، رشتے نبھاتا ہے، رزق کی تلاش کرتا ہے، اور اپنی زندگی کے تمام حقوق و فرائض ادا کرتا ہے۔ زندگی کے ہر معاملے میں یہ شخص اللہ کے نور کی اس روشنی میں فیصلہ کرتا ہے۔ اس نور کی وجہ سے زندگی کے ٹیڑھے میڑھے راستوں میں یہ شخص حق اور سچ کی سیدھی راہ کو صاف دیکھ سکتا ہے۔

دوسری طرف، وہ شخص ہے جو جہالت اور گمراہی کی تاریکیوں میں بھٹک رہا ہے اور ان اندھیروں سے نکلنے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔ اس شخص نے یہ نور قبول کرنے سے انکار کیا تو اب وہ اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ سیدھے راستوں کو چھوڑ کر ٹیڑھے راستوں پر نکل گیا ہے اور اب اس کو حق اور باطل، صحیح اور غلط، بیک اور جھوٹ کا فرق نظر ہی نہیں آتا۔ اب اسے اپنے گناہ، اپنی بد کاریاں، اپنے ظلم اور زیادتیاں، اپنے فساد، اپنی حماقتیں اور غلط فیصلے سب ٹھیک لگتے ہیں، بلکہ وہ ان پر فخر محسوس کرتا ہے۔

تو کیا وہ شخص جو اپنے منہ کے بل گھست رہا ہے زیادہ ہدایت پر ہے یا وہ جو سر اٹھائے سیدھا ایک ہموار سڑک پر
چل رہا ہو؟ (سورۃ الملک: 22)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی تبدیلی (transformation) کے دو مرحلے بتائے ہیں۔ پہلا موت سے زندگی کی طرف کا سفر اور دوسرا اندھیروں سے نکل کر روشنی تک کا سفر۔ یہ دونوں مرافق انسان قرآن کی مدد سے طے کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو روح بھی کہا اور نور بھی۔ ”روح“ اس لیے کہا کیونکہ جیسے روح مردہ جسم کو زندگی دیتی ہے ویسے ہی قرآن مردہ دل میں جان ڈال دیتا ہے اور ”نور“ اس لیے کہا کیونکہ یہ انسان کو گمراہی کے اندھیروں سے نکال کر ہدایت کی روشنی تک لے آتا ہے، اس کی روشنی میں انسان کو حق و باطل کا فرق صاف نظر آنے لگتا ہے، جیسے جیسے انسان علم و حکمت کی منزیلیں طے کرتا ہے اس کا نور بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس کے لیے صراط مستقیم پر چلانا آسان ہو جاتا ہے۔

”اور اسی طرح (اے بنی اسرائیل) ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے ایک روح (یعنی قرآن) بطور وحی بھیجی، آپ اللہ تعالیٰ کو (اس سے پہلے) نہیں معلوم تھا کہ کتاب اور (حقیقی) ایمان کیا ہے۔ لیکن ہم نے اسے (یعنی قرآن کو) ایک نور بنایا، جس کے ذریعے سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کی چاہیں رہنمائی کرتے ہیں۔ اور آپ واقعی سیدھے راستے کی رہنمائی کر رہے ہیں (سورۃ الشوری: 52)

نبی پاک اللہ تعالیٰ نے بتاتا کے آخرت کے دن بھی سخت تاریکی ہو گی اور ایسے میں پل صراط سے وہی لوگ گزر پائے گا جس کے پاس ایمان اور نیک اعمال کا نور ہو گا۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَى نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ

اس دن جبکہ تم مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہو گا (سورۃ الحمد: 12)

علماء کرام نے فرمایا کہ جس نے اس دنیا میں یہ نور پالیا آخرت میں بھی اسی کو نور کامل ملے گا، اور جس نے دنیا میں صراط مستقیم پر چلنے میں جلدی کی آخرت میں وہی تیزی سے پل صراط کو پار کر پائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دنیا اور آخرت میں یہ نور کامل پانے کے لیے بہت خوبصورت دعا سکھائی:

رَبَّنَا أَتَمِّمْ لَنَا نُورَنَا وَأَغْفِرْ لَنَا إِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

اے ہمارے رب ہمارے لئے ہمارا نور مکمل کر دے اور ہم سے در گزر فرماء، بیشک توہہ چیز پر قدرت رکھتا ہے (سورۃ التیریم: 8)

سورة الاعراف



نَفْسٌ لَا تَشْبَعُ

(ایسا نفس جو کبھی سیر نہ ہو)

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَأَتَبَعَ هَوَلَهُ^۱
 فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِن تَحْمِلُ عَلَيْهِ يَلْهَثُ أَوْ تَنْرُكُهُ يَلْهَثُ ذَلِكَ
 مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا لِبَاءَتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ
 يَتَفَكَّرُونَ

اور اگر ہم چاہتے تو ان (آیات) کے ذریعے سے اسے بلند کرتے مگر وہ توزیں کی طرف ہی
 دھنستا چلا گیا اور اس نے اپنی خواہشات کی پیروی کی تو اس کی مثال کتے کی سی ہے اگر تم اس
 کے اوپر بوجھ رکھو تب بھی ہانپے گا اور اگر چھوڑ بھی دو تب بھی ہانپتار ہے گا یہی مثال ہے
 اس قوم کی (بھی) جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلا یا سو (اے نبی ﷺ !) آپ یہ واقعات
 سناد تبیحے شاید کہ یہ تفکر کریں۔ (سورۃ الاعراف: 176)

اس آیت میں اللہ سبحان و تعالیٰ ایک ایسے شخص کا ذکر کرتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات کا علم عطا فرمایا:

اور اے نبیؐ، ان کے سامنے اُس شخص کا حال بیان کریں جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا۔ مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا۔ آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا
(سورۃ الاعراف: 175)

یعنی یہ ایک ایسے شخص کی مثال ہے جو علم رکھتا تھا، حقیقت سے واقف تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی آیات کا علم عطا کیا، علم کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ اس کے عمل میں تبدیلی آتی، وہ اللہ کی آیات کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالتا، اللہ کے احکامات کی پابندی کرتا اور گناہوں سے پچتا۔ سخن کا مطلب جب سانپ اپنی کھال میں سے نکل آئے، اللہ تعالیٰ نے اسے عزت بخشی لیکن اس نے قدر نہ کی اور اس وقار کی چادر کو انتار پھینکا۔ جیسے ہی شیطان نے اس کے رویے میں جھوول دیکھا تو وہ بھی اس کے پیچھے پڑ گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان ہر لمحہ نیک اور دیندار لوگوں کی گھات میں رہتا ہے، جیسے ہی یہ شخص ذرا سیدھے راستے سے پھسلتا ہے تو شیطان اس موقعے کا بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے اور اس شخص کو مکمل طور پر گمراہ کر کے ہی دم لیتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اگر ہم چاہتے تو اسے ان آتوں کے ذریعے سے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین کی طرف دھستا ہی چلا گیا اور اس نے اپنی خواہشات کی پیروی کی۔ انسان کا وجود دو طرح کی چیزوں سے مل کر بنتا ہے۔ ایک انسان کا حیوانی جسم ہے، جو مٹی سے بنا، زمین سے ہی اس کی تمام ضروریات پوری ہوتی ہیں، جسم کی خوراک، آرائش، زیبائش، رہن سہن سب زمین پر ہی ہے اور مرنے کے بعد انسان کا جسم اسی مٹی میں ہی لوٹا دیا جاتا ہے۔ انسان کے اس جسم کی ضروریات اور شہوات زیادہ تر جانوروں جیسی ہیں۔ لیکن پھر انسان کا ایک دوسرا جز ہے، اس کی آفاقی روح جو اسے اشرف الخلوقات بناتی ہے۔ یہ روح آسمان سے آئی اور آسمان سے نازل ہونے والی وحی ہی اس روح کی غذا ہے، پھر مرنے کے بعد یہ روح واپس آسمان کو ہی لوٹ جاتی ہے۔ اگر انسان اپنی روح کی نشوونما کرے تو یہ روح انسان کو بلند کرتی ہے یہاں تک کہ فرشتوں سے بھی اوپر لے جاتی ہے۔ لیکن اگر انسان اپنے جسم کی خواہشات کے پیچے بھاگے تو یہ انسان کو پتیوں میں دھکیل دیتی ہیں یہاں تک کہ انسان جانوروں سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر نقدیر سے پہلے

علم کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ یہ شخص دنیا کا لالج چھوڑ کر روحانی اور اخلاقی بلندی کی تلاش میں لگتا لیکن یہ شخص دنیا کے فائدوں، لذتوں اور آرائشوں کی طرف جھک پڑا، خواہشات نفس کے پیچھے بھاگنے لگا، دنیا کی حرص و طمع میں پڑ گیا اور زمین میں دھستا ہی چلا گیا۔ اللہ تعالیٰ اس شخص کی مثال ایک کتے سے دیتے ہیں کہ اگر اس پر کام کا بوجھ ڈالو تو توبہ بھی اس کی زبان لٹکی رہتی ہے اور اگر اس پر کوئی بوجھ نہ ڈالو تو توبہ بھی اس کی زبان لٹکی رہتی ہے۔ لٹکی ہوئی زبان سے مراد ایک نہ ختم والی حرث اور کبھی نہ سیر ہونے

والا نفس ہے۔ کتنے کی جگہ (nature) میں حرص کوٹ کوٹ کے بھری ہوتی ہے۔ وہ چلتا ہے تو زمین کو سو نگھارہتا ہے کہ شاید کہیں کوئی ہڈی مل جائے۔ اس پر بوجھ ڈالو تو ہانپتا ہے اور اگر آرام سے کہیں بیٹھا ہو تب بھی ہانپتا رہتا ہے۔ بھوکا ہو تب بھی زبان لکھی رہتی ہے اور اگر پیٹ بھر کے کھالے تب بھی اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ یعنی کبھی نہ ختم ہونے والا لامب اور حرص کتنے کی فطرت کا حصہ ہے۔ ایسے ہی جو شخص دنیا کی محبت میں پڑ جائے تو چاہے اس کو جتنی دولت، طاقت، شہرت، کامیابی مل جائے اس کی زبان لکھی ہی رہتی ہے اور اس کا لامب کبھی ختم نہیں ہوتا۔

اس مثال میں بوجھ سے مراد اللہ کے کلام کی ذمہ داری ہے۔ جب کسی انسان یا قوم کو اللہ کی کتاب کا علم مل جائے تو ان پر اس علم کی ذمہ داری کا بھاری بوجھ آ جاتا ہے، اللہ کے احکامات کی پابندی کا بوجھ، اللہ کی کتاب کے مطابق اپنی زندگی کو بدلنے کی ذمہ داری، اپنے نفس کی خواہشات کے خلاف جہاد اور اللہ کی آیات کو اپنی زبان اور کردار سے آگے پہچانے کا مشن۔ جس شخص کے پاس اللہ کی کتاب کا علم نہ ہو اور وہ اپنی خواہشات نفس کی پیروی کرے تو پھر بھی بات سمجھ آتی ہے لیکن جس کو علم مل گیا پھر بھی حرص، لامب، ہوس، شہوت اور طمع میں کوئی کمی نہیں آتی تو اس کی مثال اس کتنے جیسی ہے کہ جس کا نفس کبھی سیر نہیں ہوتا۔

کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا کیا تم ایسے شخص کو راہ راست پر لے آنے کا ذمہ لے سکتے ہو (سورۃ الفرقان: 43)

اس آیت سے ایک بہت اہم بات یہ سمجھ آتی ہے کہ صرف علم انسان کو روحاںی بلندی نہیں دے سکتا، ہم سارا قرآن حفظ کر لیں، بے شمار احادیث یاد کر لیں، درجنوں تفاسیر پڑھ لیں لیکن جب تک عمل میں تبدیلی نہیں آئے گی یہ علم کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اسی لیے ہمیشہ نافع علم کی دعا کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات ہم سب کو عطا کی ہیں، چاہے وہ کوئی ایسا شخص ہو جس نے کئی سال قرآن پڑھا اور سمجھا ہو یا کوئی ایسا جس کے پاس قرآن کی ایک آیت کا علم ہو۔ اگر علم ہونے کے باوجود عمل میں کوئی تبدیلی نہ آئے اور انسان جانوروں کی طرح نفس ہی کے پیچھے بھاگتا رہے، اپنی خواہشات اور شہوات ہی کا غلام بنارہے، آخرت کے بجائے اس کی ساری دوڑھوپ دنیا کے پیچھے ہو تو ایسے شخص کو اس کا علم کوئی فائدہ نہیں دیتا۔ ایسا شخص بلند ہونے کے بجائے زمین میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ پھر اس کی مثال ایک کتنے جیسی ہو جاتی ہے کہ جس کا نفس کبھی سیر نہیں ہوتا۔ نبی پاک ﷺ نے ہمیں ایسے نفس سے پناہ مانگنے کے لیے دعا سکھائی ہے اور ایسے علم سے جو نفع بخش نہ ہو:

اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَا يَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَا
تَشْبِعُ وَمِنْ دَعْوَةٍ لَا يُسْتَجَابُ لَهَا

اے اللہ! میں تجھ سے ایسے علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں جو کوئی فائدہ نہ دے اور ایسے دل سے جو (تیرے آگے) جھک کر مطمئن نہ ہوتا ہو اور ایسے نفس سے جو سیر نہ ہو اور ایسی دعا سے جسے شرف قبولیت نصیب نہ ہو۔ (صحیح مسلم: 6906)

بَلْ هُمْ أَضَلُّ

(جانوروں سے بھی گئے گزرے)



وَلَقَدْ ذَرَ أَنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ عَذَابٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا إِنَّمَا كَلَّا نَعْمَلُ بِنُهْمٍ أَضَلُّ إِنَّمَا هُمْ

الْغَافِلُونَ

اور یقیناً بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں۔ ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے، یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے ہوئے ہیں

(سورۃ الاعراف: 179)

اللہ تعالیٰ اس آیت میں ہمیں ایک خوفناک حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں کہ بے شمار ایسے انسان اور جن ہیں جو جہنم کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ نے انہیں پیدا ہی اس مقصد کے لیے کیا تھا کہ وہ جہنم میں جائیں بلکہ اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی غفلت کی وجہ سے خود جہنم اپنی قسمت میں لکھوا لی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں۔ ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔ **أُولَئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ** یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں گھوئے ہوئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے دل، آنکھیں اور کان توجانوروں کو بھی دیے ہیں لیکن وہ ان صلاحیتوں کو محض اپنے جسم کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ چوپا یوں کی تمام تر تگ و دو صرف اپنے جسم کی ضروریات تک محدود ہے۔ لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشرف الخلوقات بنایا اور اسے یہ صلاحیتیں اس لیے عطا کیں کہ وہ انہیں استعمال کر کے علم حاصل کرے، اللہ کو پہچانے اور اپنی زندگی کا اصل مقصد سمجھ سکے۔

قُلْ هُوَ اللَّهُ أَنَّا شَاءْ كُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ الْسَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْعَادَةَ قَلِيلًا مَا تَشْكُرُونَ

ان سے کہو، اللہ ہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، تم کو سنتے اور دیکھنے کی طاقتیں دیں اور سوچنے سمجھنے والے دل دیئے، مگر تم کم ہی شکردا کرتے ہو (سورۃ الملک: 23)

اللہ کی دی ہوئی نعمتوں اور صلاحیتوں کی شکر گزاری یہ ہے کہ انسان ان صلاحیتوں کو اللہ تک پہنچنے کا زریعہ بنائے۔ یہ تین ہی طریقے ہیں جن کے زریعے انسان ہدایت پاسکتا ہے۔ یا تو انکھوں سے اللہ کی تخلیق اور قدرت کو دیکھ کر، یا کانوں سے اللہ کا ذکر اور اللہ کی آیات سن کر یا پھر ایسے ذاتی تجربات اور واقعات جو انسان کے دل کو اللہ کی طرف مائل کر دیں۔ لیکن ہم میں سے کتنے لوگ شدید ترین غفلت کا شکار ہیں، ہم آنکھیں تو رکھتے ہیں لیکن بصارت نہیں، کانوں سے سنتے تو ہیں مگر ساعت نہیں رکھتے، ہمارے پاس دل تو ہیں لیکن بس جانوروں کی طرح کے مادی دل، ایسے دل جو نہ تو اللہ کو پہچانتے ہیں اور نہ ہی اللہ کی آیات سن کر پکھلتے ہیں۔ جو پچھلی قومیں اپنی غفلت کی وجہ سے بر باد ہو گئیں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ان کو ہم نے کان، آنکھیں اور دل، سب کچھ دے رکھے تھے، مگر وہ کان ان کے کسی کام آئے، نہ آنکھیں، نہ دل۔ کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار ہی کرتے رہے (سورۃ الاحقاف: 26)

اے اہل نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اُولَئِکَ الْأَنْعَمُ بَلْ هُمْ أَهَلُ ایے لوگ چوپايوں کی مانند ہیں یا پھر ان سے بھی گئے گزرے۔ چوپايوں کو اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لیے پیدا فرمایا وہ اس مقصد کو پورا کر رہے ہیں۔ ان جانوروں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے مسخر کر دیا، کچھ انسان کے لیے خوارک کا کام دیتے ہیں اور کچھ سواری کا۔ وہ تخلیق کے لحاظ سے انسان سے کم تر ہیں لیکن وہ اللہ کے نافرمان نہیں ہیں۔ اللہ کی تمام مخلوق زمین، انسان، پیڑا، چرند، پرند اور تمام جانور اللہ کے ذکر میں مشغول ہیں۔

ساتوں آسمان اور زمین اور (وہ تمام مخلوق بھی) جوان میں ہے، وہ اسی (اللہ) کی تسبیح میں لگے ہوئے ہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو، مگر تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو۔ یقیناً وہ بہت تحمل والا بہت بخشش والا ہے (سورۃ الاسراء: 44)

صرف ایک انسان ہی ایسی مخلوق ہے جو اللہ کی یاد سے غافل ہے۔ اللہ نے انسان کو شرف دیا، اسے علم عطا کیا، فرشتوں سے سجدہ کروایا، اپنا خلیفہ بنایا لیکن انسان اپنا مقام چھوڑ کر اپنی خواہشات نفس کا غلام بن گیا، اور اپنا اصل مقصد حیات بھول گیا۔ اور یوں انسان اپنی نافرمانی کی وجہ سے جانوروں سے بھی نیچے گر گیا۔

ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ پھر ہم نے لوٹا دیا اس کو پست ترین حالت کی طرف
(سورۃ انتیں: 4-5)

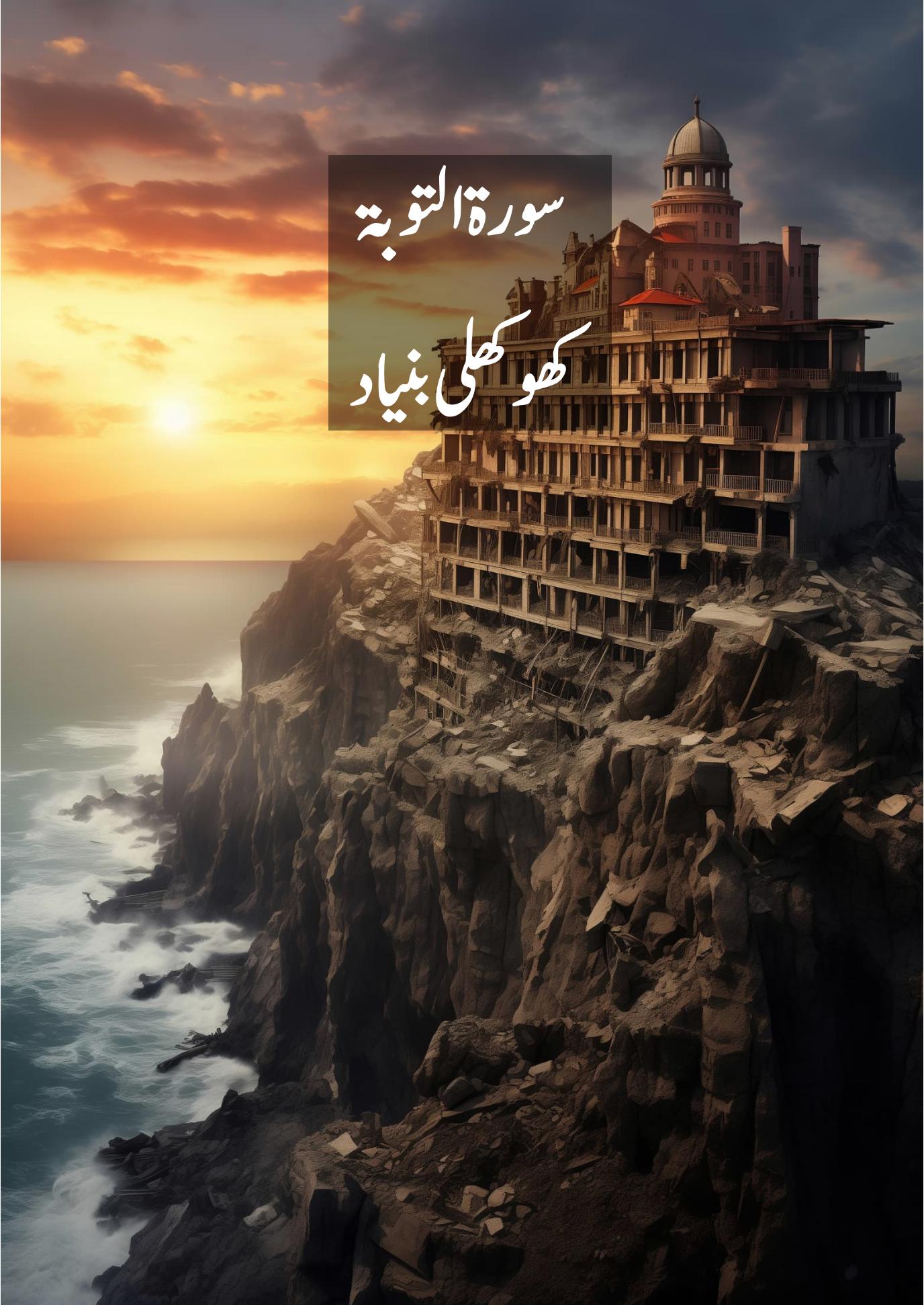
جن لوگوں کے دل اللہ کی یاد اور آخرت کے خوف سے غافل ہیں ان کی مثال چوپايوں ہیں اس لیے بھی ہے کہ چوپائے خطروں کو بجانپنے اور خود کو اس سے بچانے کی تدبیر کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ کوئی بہت تیز رفتار گاڑی بھی آرہی ہو تو بھی گائے سوچ سمجھے بغیر سڑک پر آ جاتی ہے۔ چوپائے اپنا چاراچر نے میں اس قدر مصروف ہوتے ہیں کہ جب تک خطروں سر پر نہ آن پہنچے، ان کی نظر اس طرف نہیں جاتی۔ بالکل ایسے ہی غفلت میں پڑا انسان اپنی مادی خواہشات پوری کرنے میں اس قدر مصروف ہوتا ہے کہ آخرت کے خطرے کا احساس تک نہیں رہتا۔ انسان اپنی دھن میں مگن دنیا کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے میہاں تک کہ حساب کا دن آن پہنچتا ہے اور اسے وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

أَقْتَرَبَ إِلَيْنَا سِرِّ حِسَابِهِمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّغْرِضُونَ

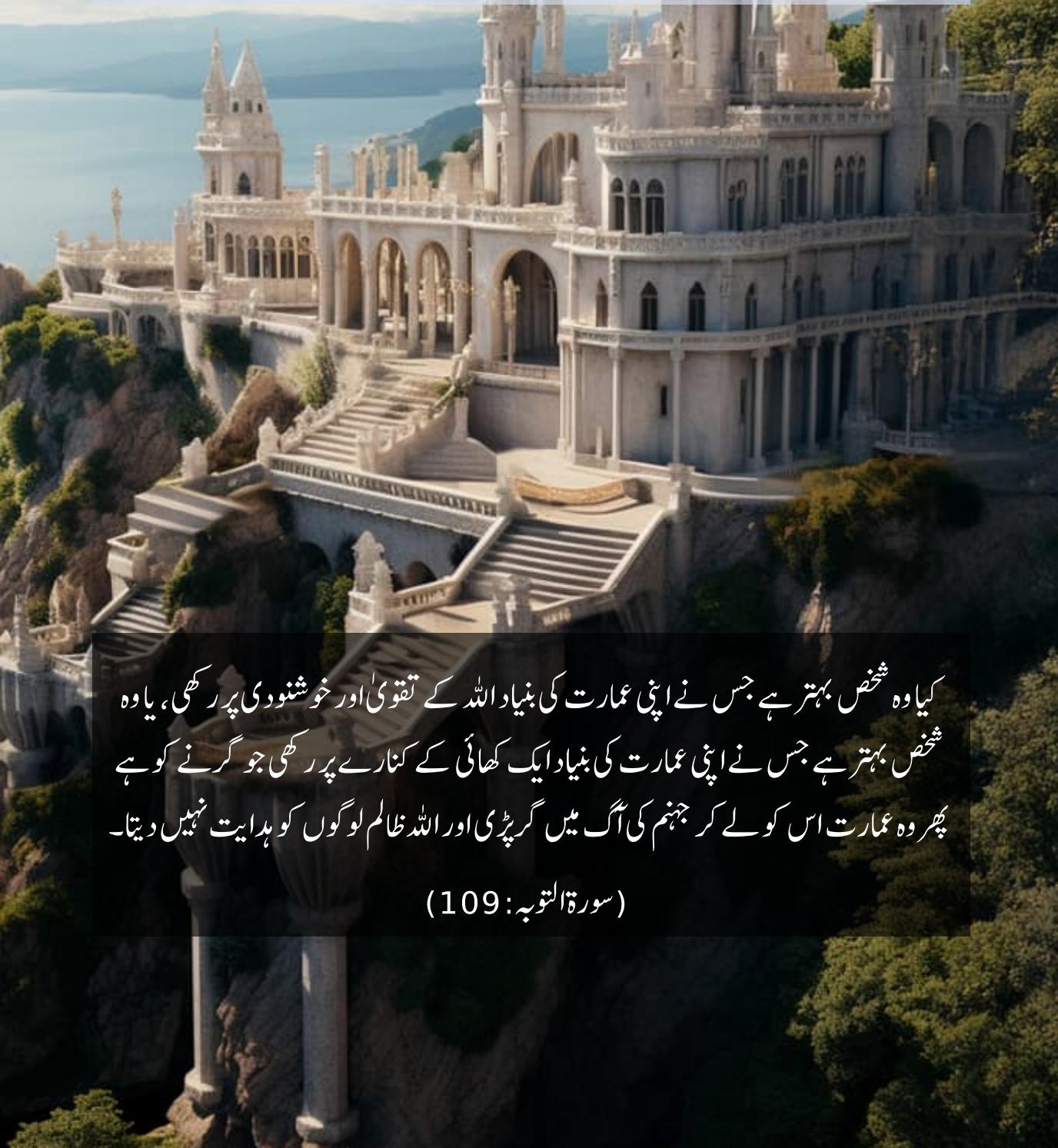
لوگوں کا حساب (اعمال کا وقت) نزدیک آپنچا ہے اور وہ غفلت میں (پڑے اس سے) منہ پھیرے ہوئے ہیں
(سورۃ انبیاء: 1)

سورة التوبة

کھو کھلی بنیاد



أَفَمْنُ أَسَسَ بُنْيَانَهُ عَلَى تَقْوَىٰ مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَنٍ خَيْرٌ أَمْ مَنْ
أَسَسَ بُنْيَانَهُ عَلَى شَفَا جُرْفٍ هَارِ فَانْهَارَ بِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ وَاللَّهُ
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ



کیا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے تقویٰ اور خوشنودی پر رکھی، یا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد ایک کھائی کے کنارے پر رکھی جو گرنے کو ہے پھر وہ عمارت اس کو لے کر جہنم کی آگ میں گر پڑی اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

(سورۃ التوبہ: 109)

اس آیت میں اللہ سبحان و تعالیٰ دو طرح کی عمارتوں کی مثال دیتے ہیں۔ ایک وہ عمارت جو مظبوط اور پائیدار بنیاد پر بنائی گئی ہو۔ اور دوسرا وہ جو جرف کے کنارے پر ہو۔ جرف ایسے پہاڑ یا ٹیلے کو کہتے ہیں جس کا نچلا حصہ کسی سیلاب، دریا کے بہاؤ یا سمندر کی لہروں کی وجہ سے کٹ کٹ کر بہہ گیا ہو اور پیچھے کھوکھلی مٹی رہ گئی ہو۔ جو عمارت اس ٹیلے کے کنارے پر بنائی گئی ہو وہ چاہے اوپر سے دیکھنے میں جتنی بھی مظبوط اور خوبصورت لگے اس کی بنیاد بیس کمزور ہوتی ہیں۔ جیسے ہی کوئی سیلاب یا سمندر کی تیز لہریں آئیں گی یہ عمارت اپنی تمام ظاہری شان و شوکت کے باوجود گہری کھائی میں جا گرے گی۔

یہاں عمارتوں سے مراد مختلف قسم کے لوگ اور ان کے نیک اعمال ہیں۔ ظاہری طور پر نیک اعمال، عمارتوں کی طرح بہت خوبصورت نظر آتے ہیں، چاہے یہ عمل کرنے والا مسلمان ہو، محسن ہو، مومن، مسلم، صالح، فاجر یا منافق۔ بعض اوقات تو منافق کا ظاہری عمل دیکھنے میں شاید محسن سے بھی بہتر لگے۔ نبی پاک ﷺ کے زمانے میں بھی منافقوں کا ظاہری کردار اور ان کی بات چیت لوگوں کو بہت متاثر کرتی تھی۔

(اے نبی ﷺ! جب آپ انہیں (منافقین کو) دیکھتے ہیں تو ان کے جسم (ڈیل ڈول) آپ کو بڑے اچھے لگتے ہیں۔ اور اگر وہ بات کرتے ہیں تو آپ ﷺ ان کی بات سنتے ہیں۔ (سورۃ المنافقون: 4)

حضرت عبد اللہ بن عباس بیان کرتے ہیں کہ عبد اللہ بن ابی (منافقین کا سردار) بڑے ڈیل ڈول کا، تندrst، خوش شکل اور چرب زبان آدمی تھا۔ اور یہی شان اس کے بہت سے ساتھیوں کی تھی۔ یہ سب مدینہ کے رکیس لوگ تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں آتے تو دیواروں سے تکیے لگا کر بیٹھتے اور بڑی لچھے دار باتیں کرتے۔ عبد اللہ ابن ابی اکثر پسلی صف میں نمازیں پڑھا کرتا تھا۔ اسی زمانے میں منافقین نے قبا کے علاقے میں ایک مسجد بھی بنالی جس کا ذکر سورۃ توبہ میں آیا ہے، ظاہری طور پر تو انہوں نے بہت نیک کام کیا لیکن ان کا اصل مقصد مسلمانوں کو نقصان پہچانا اور تفرقہ پھیلانا تھا۔ ایک طرف مسجد قبا تھی جو مومنین نے تقویٰ کی بنیاد پر بنائی تھی اور دوسری طرف یہ منافقین کی مسجد جسے اللہ تعالیٰ نے مسجد ضرار (نقصان پہچانے والی) کہا۔ اسی پس منظر میں یہ مثال نازل ہوئی کہ جیسے ظاہری طور پر تمام خوبصورت عمارتیں ایک جیسی لگتی ہیں اور دیکھنے والے کو دھوکے میں ڈال دیتی ہیں، ایسے ہی منافقین اور صالحین کے نیک اعمال میں فرق کرنا مشکل ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں فرق عمارتوں میں نہیں بلکہ ان کی بنیادوں میں ہوتا ہے۔ ایک شخص جس نے نیک عمل کرنے سے پہلے بنیادوں پر کام کیا، اپنی عمارت کی بنیاد ایمان، تقویٰ اور اللہ کی خوشنودی پر رکھی، تو وہ ایک مظبوط عمارت کی طرح ہے جسے سمندر کے جتنے بھی تپھیرے پڑیں، جتنے بھی سیلاب آئیں یہ عمارت اپنی جگہ مظبوطی سے کھڑی رہتی ہے۔ مومنین کی یہی نشانی ہوتی ہے کہ جتنے

بھی مشکل حالات آئیں، مال اور جان کی قربانی دینی پڑے ان کا ایمان کبھی نہیں ڈگ گتا، وہ اللہ کی رضا کی خاطر اپنی جگہ جے رہتے ہیں، ثابت قدم رہتے ہیں۔

لیکن دوسری طرف منافق ہے، ظاہری طور پر ایک زبردست مسلمان، بالتوں اور ایمان کے داعوں میں مومنین سے بھی آگے۔ دیکھنے والے کو گلے شاید اس کا ایمان زیادہ مظبوط ہے۔ لیکن جب سمندر کی لمبی ذرا تیز ہوئیں تو ان کے ایمان کی جڑیں بل گئی، ان کے تمام دعوے، عہد و پیام دھرے کے دھرے رہ گئے۔ جب اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے قربانیاں دینے کا وقت آیا، مال خرچ کرنے اور جہاد پر جانے کا وقت آیا، تو ان کی ایمان کی کمزوری سب پر ظاہر ہو گئی۔

كَانُهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدٌ

(لیکن اصل میں) یہ دیوار سے لگائی ہوئی کھوکھلی لکڑیوں کی مانند ہیں (سورۃ المنافقون: 4)

لکڑی اگر کھوکھلی ہو تو دیکھنے میں تو کار آمد نظر آتی ہے لیکن اصل میں بالکل بیکار ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کا یہ کھوکھلا ایمان انہیں جہنم کی کھائی میں لے گرے۔ جیسے اگر عمارت کی جڑیں کھوکھلی ہوں تو وہ اپنی تمام تر خوبصورتی اور شان و شوکت کے باوجود کھائی میں گرجاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس شخص کے نیک عمل کی بنیاد مظبوط ایمان، تقوے اور اللہ کی رضا پر نہ ہو، اس کی نیکی اس کے کسی کام نہیں آتی اور ایسا شخص اپنی تمام تر ظاہری نیکیوں کے باوجود جہنم کی کھائی میں گرجاتا ہے۔

وَقَدِمَنَا إِلَيْنَا مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَّذْشُورًا

اور ہم آگے بڑھیں گے ان کے ہر عمل کی طرف جو انسوں نے کیا ہو گا اور اسے اڑتی ہوئی خاک کر دیں گے (سورۃ الفرقان: 23)

کسی بھی عمل کی قولیت کے لیے بنیادی شرط ایمان ہے۔ جس عمل کے پیچھے ایمان، تقویٰ اور اللہ کی رضا ہے وہی در حقیقت انسان کے کام آئے گا۔ اس لیے نیک اعمال کا ڈھیر لگانے سے پہلے اپنے دل میں عقیدے اور ایمان کی بنیادوں کو مظبوط کرنا زیادہ ضروری ہے۔

اور جو نیک عمل کرے گا؛ خواہ مرد ہو یا عورت، بشر طیکہ ہو وہ مومن تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی (سورۃ النساء: 124)

سورة قيوںس

مَتَاعُ الْغُرُورِ

دھوکے کا سامان



إِنَّمَا مَثُلُ الْحَيَاةُ أَلْدُنْيَا كَمَا إِنَّ رُلَّهُ مِنَ السَّمَاءِ فَأُخْتَلَطَ بِهِ
نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ حَتَّىٰ إِذَا أَخْذَتِ الْأَرْضُ
زُخْرُفَهَا وَأَزَّبَنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَدِيرُونَ عَلَيْهَا أَنْهَا أَمْرُنَا
لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيدًا كَانَ لَمْ تَغُنِ بِالْأُمُّسِ كَذِلِكَ

نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ

دنیا کی زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے ہم نے پانی بر سایا پھر یہ زمین کی پیداوار، جسے آدمی اور جانور سب کھاتے ہیں، خوب کھنی ہو گئی، پھر عین اس وقت جب کہ زمین اپنی بہار پر تھی اور کھیتیاں بنی سنوری کھڑی تھیں اور ان کے مالک سمجھ رہے تھے کہ اب ہم ان سے فالدہ اٹھانے پر قادر ہیں، یکایک رات کو یادن کو ہمارا حکم آگیا اور ہم نے اسے ایسا غارت کر کے رکھ دیا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اسی طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں۔ (سورۃ یونس: 24)

یہاں اللہ تعالیٰ انسانی زندگی کی مثال بارش سے دیتے ہیں، کہ جب بارش برستی ہے تو پانی زمین کے ساتھ آگر مل جاتا ہے، جس سے زمین پھلنے پھولنے لگتی ہے، ہر طرح کی نباتات اور سبزہ پیدا ہوتا ہے۔ اس زمین سے انسانوں اور جانوروں کے لیے خوراک پیدا ہوتی ہے یعنی پھل، سبزیاں وغیرہ۔ پھر جب زمین پوری طرح سے سنگھار کر لیتی ہے، اور فصل اپنے جوبن پر ہوتی ہے تو کسان خوشی سے پھولے نہیں ساتھ فصل مکمل طور پر تیار ہے، پھل اور انماج بکثرت ہے اور اب اس محنت کا فائدہ اٹھانے کا وقت آگیا۔ لیکن پھر اچانک اللہ کا امر، یعنی اللہ کا فیصلہ آگیا۔ کوئی آندھی، سیلاہ، برف باری یا اولے گرے اور ساری کی ساری فصل ایسے غائب ہو گئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔

دنیاوی زندگی کی مثال بھی ایسی ہی ہے، یہاں بارش سے مراد انسان کی روح ہے، جیسے بارش مردہ زمین کو زندگی دیتی ہے بالکل ایسے ہی انسان کی روح ماں کی کوکھ میں جو ایک بیچ پل رہا ہوتا ہے اسے زندگی دیتی ہے، مردہ جسم میں جان ڈال دیتی ہے۔ اس روح کی بدولت انسان کا جسم اس دنیا میں آنے کے قابل ہوتا ہے، جو ان ہوتا ہے، پھلتا پھولتا ہے، مختلف قسم کے علم اور ہنر حاصل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے اور اپنے ارد گرد کے لوگوں کے لیے فائدے کا سبب بن جاتا ہے۔ جیسے زمین کے رزق سے جانور اور انسان سبھی فائدہ اٹھاتے ہیں ویسے ہی انسان کی صلاحیتوں اور کمائی سے اس کے ارد گرد کے لوگ فائدہ اٹھانا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر ایک وقت آتا ہے جب انسان کی زندگی مکمل جوبن پر ہوتی ہے، اولاد اور مال کی فراوانی ہوتی ہے۔ ایسے میں انسان کو لگنے لگتا ہے کہ اب وہ با اختیار ہے، اب محنت کا پھل کھاس کتا ہے اور فصل کاٹنے کا وقت آگیا۔ اب وہ آرام سے بیٹھ کر جب چاہے اور جب تک چاہے اپنی عمر بھر کی محنت کا پھل کھاس کتا ہے ایسے میں اچانک اللہ کی طرف سے اس کی موت کا فیصلہ صادر ہو جاتا ہے، روح نکل جاتی ہے، اور جسم ایک بار پھر سے مردہ زمین کی طرح یوں بے جان ہو جاتا ہے جیسے کبھی اس میں کوئی زندگی تھی ہی نہیں۔

اس (زندگی) کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشت کا رخوش ہو گئے۔ پھر وہی کھتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہو گئی۔ پھر چوراچورا ہو جاتی ہے (سورۃ الحمد: 20)

انسان ساری زندگی اس دنیا کی دوڑ دھوپ میں لگا رہتا ہے، پہلے پڑھائی، پھر سکول، کالج، نوکری، بزنس، پھر اولاد کے پیچھے وہی بھاگ دوڑ۔ انسان کی ساری محنت بس مال اور اولاد کے ارد گرد گھومتی رہتی ہے۔ لیکن ایک دن سب ختم ہو جاتا ہے اور موت کے بعد دنیا کے پیچھے بھاگنے والا شخص غالباً ہاتھ کھڑا رہ جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

میت کے ساتھ (قبرستان تک) تین چیزیں جاتی ہیں۔ اس کے گھروالے، اس کا مال اور اس کا عمل۔ ان میں سے دولوث آتی ہیں اور ایک ساتھ رہ جاتی ہے۔ گھروالے اور مال دولوث آتے ہیں اور عمل ساتھ رہ جاتا ہے۔

(صحیح مسلم: 7424)

اللہ سبحان و تعالیٰ فرماتے ہیں:

۝ الْمَأْلُ وَالْبَعْنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَاۚ وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ
ثَوَابًا وَخَيْرٌ أَمَلًا

یہ مال اور یہ اولاد محض دنیوی زندگی کی ایک ہنگامی آرائش (زینت) ہے۔ اصل میں تو باقی رہ جانے وال نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے بہتر ہیں اور انہی سے اچھی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

(سورۃ الکھف: 46)

اسی لیے اللہ تعالیٰ بار بار قرآن میں ایسی مثالوں سے انسان کو دنیا کی بے ثباتی کا سبق دیتے ہیں لیکن انسان جیسے ہی دنیا میں آنکھ کھولتا ہے یہاں کی چکا چوند میں کھو جاتا ہے اور آخرت اور اپنے اصل گھر کو سراسر فراموش کر دیتا ہے۔

وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ

اور دنیا کی زندگی تو سوائے دھوکے کے ساز و سامان کے اور کچھ نہیں ہے (سورۃ الحمد: 20)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

دنیا کی مثال آخرت کے مقابلے میں ایسی ہی ہے جیسے تم میں سے کوئی اپنی انگلی سمندر میں ڈالے، اور پھر دیکھ کر کتنا پانی اس کی انگلی میں واپس آتا ہے۔ (سنن ابن ماجہ: 4108)

یعنی جو پانی انگلی پر لگا رہ گیا وہ دنیا ہے اور پیچھے ٹھانٹھے مارتا ہوا سمندر آخرت ہے۔ لیکن اس بار بار نصیحت کے باوجودہ، اگر ہم اپنی زندگیوں کا جائزہ لیں تو ذرا دیکھیں کہ ہماری تمام تر محنت، کوشش، بھاگ دوڑ اور پریشانی کس کے لیے ہے؟ دنیا کے لیے یا آخرت کے لیے؟

بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَاۖ وَإِلَّا خَرَةٌ خَيْرٌ وَآبَقَ۝

مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے
(سورۃ الاعلیٰ: 16-17)

زندگی کی کششی



هُوَ الَّذِي يُسَيِّدُ كُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ
وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحْوَابِهَا جَاءَتُهَا رِيحٌ عَاصِفٌ
وَجَاءَهُمْ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُولُ أَنْهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ دَعْوَلُ
اللَّهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الَّذِينَ لَئِنْ أَنْجَيْتَنَا مِنْ هَذِهِ الْنَّكُونَنَّ مِنَ
الشَّاكِرِينَ

وہی (اللہ) ہے جو تمہیں خشکی اور سمندر میں سیر کرتا ہے یہاں تک کہ جب تم کشتیوں پہ سوار ہوتے ہو اور وہ انہیں (سواروں کو) خوشگوار (موافق) ہوا کے ساتھ لے کر چل رہی ہوتی ہیں، اور وہ بہت خوش ہوتے ہیں کہ اچانک تیز ہوا کا جھکڑ چل پڑتا ہے اور ہر طرف سے موجود ان کی طرف بڑھنے لگتی ہیں اور وہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ وہ ان (الہروں) میں گھیر لیے گئے ہیں، (اس وقت) وہ پکارتے ہیں اللہ کو اس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے کہ (اے اللہ!) اگر تو نے ہمیں اس مصیبت سے نجات دے دی تو ہم لازماً بہت شکر کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ (سورۃ یونس: 22)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ ایک کشٹی کی مثال دیتے ہیں کہ کیسے جب تک خوشگوار ہوا چل رہی ہوتی ہے تب تک مسافر خوش ہوتے ہیں، اپنی دھن میں مگن۔ لیکن جیسے ہی تیز ہوا نہیں چلنے لگتی ہیں، چاروں طرف سے بروں کے تھیڑے پڑتے ہیں اور مسافروں کو لگنے لگتا ہے کہ طوفان نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا، ایسے میں اچانک انہیں اللہ یاد آ جاتا ہے۔ اس وقت وہ ہر طرح کا شرک بھول کر اپنی اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے اللہ سے گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگتے ہیں۔

یہ کشٹی دراصل انسان کی زندگی ہے کہ جب تک آسانیاں اور راحتیں ہوتی ہیں انسان اللہ کو بھول کر اپنی زندگی میں مگن رہتا ہے۔ ایک بزرگ کے بعد دوسرا بزرگ، ایک پارٹی کے بعد دوسرا پارٹی، ایک holiday کے بعد دوسرا season، ایک فلم کے بعد دوسرا فلم، ایک netflix season کے بعد دوسرا season، زندگی کی دھن پر ناچتا ہوا انسان۔ اور ان ساری ”مصروفیات“ کے نقچ کہیں تھوڑا بہت دین بھی فٹ ہو جاتا ہے۔ اور جیسے ہی کوئی مصیبت آتی ہے، کوئی ناگہانی آفت آ جاتی ہے تو ایسے میں اچانک اللہ کرنے لگتا ہے۔ ایسے وقت میں تمام بت، دیوبتا، مزار، قبریں، پیر، فقیر، دولت، entertainment سب بھول جاتے ہیں۔ ایسے وقت میں اللہ سے دور کرنے والی ہر چیز کو بھول کر، بڑے سے بڑا مشک بھی توحید پر آ جاتا ہے۔

اور جب ہم انسان پر نعمتوں کی بارش کر دیتے ہیں تو وہ رخ پھیر لیتا ہے اور اپنا پہلو بدال لیتا ہے اور جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بڑی لمبی لمبی دعائیں کرنے لگتا ہے (سورہ فصلت: 51)

اس سلسلے میں ابو جہل کے بیٹے عکرمہ کے بارے میں بہت اہم واقعہ تاریخ میں ملتا ہے کہ فتح مد کے بعد وہ مکہ سے فرار ہو کر جب شہ جانے کے لیے بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ کشٹی میں سوار تھے کہ کشٹی اچانک طوفان میں گھر گئی۔ کشٹی میں تمام لوگ مشرکین تھے، لیکن اس مصیبت کی گھری میں کسی کو بھی لات، منات، عزیٰ اور ہبیل یاد نہ آئے اور انہوں نے مدد کے لیے صرف اللہ کو پکارا۔ اسی لمحے عکرمہ کو اس حقیقت کے انکشاف نے چونکا دیا کہ یہی تو وہ پیغام ہے جو محمد ﷺ ہمیں دے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ وابپیں لوٹ آئے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد یہی عکرمہ رضی تعالیٰ عنہ اسلام کے زبردست مجاہد ثابت ہوئے۔

توحید انسانی فطرت کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ ہر روح نے دنیا میں آنے سے پہلے عالم ارواح میں اللہ سے عبودیت کا وعدہ کیا تھا۔ اس دنیا میں آنے کے بعد انسان اس وعدے کو فراموش کر بیٹھا لیکن روح کو یہ عہد و پیاس یاد ہیں۔ اس لیے جب غم کے بادل چھا جائیں، جب ہر طرف سے مشکلوں کے تھیڑے پڑنے لگیں، جب انسان مصیبتوں کے طوفان میں گھر جائے، جب باقی سب سہارے

چھوٹ جائیں اور انسان تہارہ جائے۔ ایسے میں انسان کی آنکھیں کھلتی ہیں اور اسے یاد آتا ہے کہ کون اس کا اصل سہارا ہے۔ کون اس کا اصل مشکل کشا ہے، کون اس کی کشتی کو پار لگانے کی طاقت رکھتا ہے، کون اس کا معبد برحق ہے۔

أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ

کون ہے جو بے قرار کی دعا نہیں ہے جبکہ وہ اُسے پکارے اور کون اس کی تکلیف کو دور کرتا ہے (سورۃ النمل: 62)

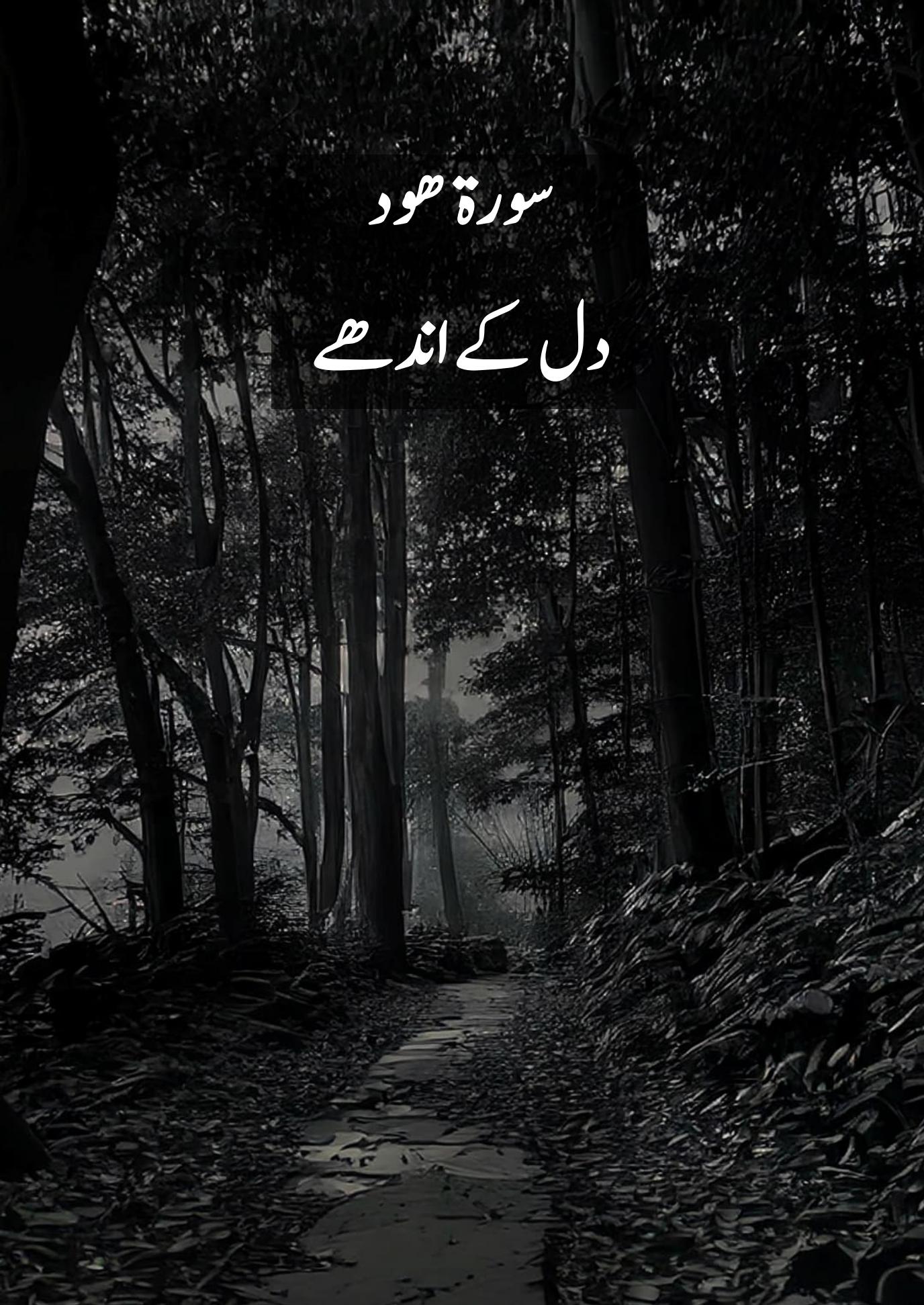
ایسے حالات میں انسان ہر قسم کے جھوٹے معبدوں کو چھوڑ کر ایک اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، دعا کیں مانگتا ہے اور اللہ سے پختہ وعدے کرنے لگتا ہے کہ ایک دفعہ مجھے اس مشکل سے نکال دے تو میں تیرا شکر گزار اور فرمانبردار بندہ ہوں گا۔ لیکن اس سے اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے خاص فضل سے انہیں اس مشکل سے نجات دے دیتا ہے تو یہ لوگ پھر اپنی پرانی ڈگر پر چلنے لگتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ انہوں نے مصیبت کے وقت اللہ سے کیا وعدے کیا تھے۔

مگر جب وہ ان کو بچالیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے مخرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں۔ لوگو، تمہاری یہ بغاوت تمہارے ہی خلاف ہے۔ دنیا کی زندگی کے چند روزہ مزے ہیں (لوٹ لو)، پھر ہماری طرف تمہیں پلٹ کر آتا ہے، اس وقت ہم تمہیں بتادیں گے کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو۔ (سورۃ یونس: 23)

یہ انسان کی ہڈدھرمی، ڈھنائی اور سخت ناشکری ہے جس کا ذکر بار بار اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا۔ جب سخت مصیبت میں ہوتا ہے تب اللہ سے دعا کیں کرتا نہیں تھکتا اور جب اللہ دعا سن لیتا ہے تو وہ دوسروں کو اپنی کامیابی کا credit دینے لگتا ہے، فلاں ڈاکٹر نے مجھے زندگی دی، فلاں استاد نے مجھے پاس کروایا، فلاں مزار پر میں نے دعا مانگی، فلاں کی قبر پر چادر چڑھائی، فلاں پیر صاحب سے پھونک مردواری۔ یا پھر اکثر لوگ اپنی عقل، سمجھ اور علم کو ہی اپنی کامیابی کی وجہ بتا کر لوگوں سے واہ واہی وصول کرتے رہتے ہیں۔ مشکل کے وقت لمبی لمبی نمازیں، تہجد، ڈھیر و دعا کیں اور اللہ سے بے شمار وعدے۔ لیکن جیسے ہی مصیبت دور ہوتی ہے انسان اللہ سے کیے ہوئے سارے وعدے بھول کر پھر سے اپنی وہی پرانی زندگی میں مشغول ہو جاتا ہے۔ سورۃ الزمر میں بھی اللہ تعالیٰ انسان کی اس ناشکری کا ذکر فرماتے ہیں:

إِنَّمَّا يَنْهَا عَنِ الرَّحْمَةِ مَنْ يَرْجُوا أَنْ يُنْجَى إِلَيْهِ مِنْ حَسْدِ أَهْلِنَّهُ وَمَنْ يَرْجُوا أَنْ يُنْجَى إِلَيْهِ مِنْ حَسْدِ أَهْلِنَّهُ

انسان پر جب کوئی آفت آتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اسے پکارتا ہے۔ پھر جب اس کا راب اسے اپنی نعمت سے نواز دیتا ہے تو وہ اس مصیبت کو بھول جاتا ہے جس کے لیے وہ پہلے دعا کیں کر رہا تھا اور دوسروں کو اللہ کا ہمسر ٹھہرائے لگتا ہے تاکہ (اور لوگوں کو بھی) اس کی راہ سے گمراہ کرے (سورۃ الزمر: 8)



سورۃ حود

دل کے اندھے



مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَى وَالْأَصْمَى وَالْبَصِيرِ وَالسَّمِيعِ هَلْ
يَسْتَوِيَا نِ مَثَلًا أَفَلَا تَذَكَّرُونَ

إن دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی تو انہا بہرا ہو اور دوسرا دیکھنے اور سُننے والا، کیا یہ دونوں یکساں ہو سکتے ہیں؟ کیا تم (اس مثال سے) کوئی سبق نہیں لیتے؟

(سورة ھود: 24)

اس آیت میں اللہ سبحان تعالیٰ دو طرح کے لوگوں کا موازنہ کرتے ہیں ایک وہ جواندھا اور بہرا ہے۔ نہ تو وہ اپنی آنکھوں سے راستہ دیکھ سکتا ہے اور اگر کوئی اس کی رہنمائی کرنا چاہے تو بہرا ہونے کی وجہ سے بات سن بھی نہیں سکتا۔ اور دوسرا وہ ہے کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی سکتا ہے اور اگر کہیں راستے سے بھٹکنے لگے تو کسی ایسے کی بات سن بھی سکتا ہے جو راستے سے واقف ہو۔ کیا ان دونوں کا انجام ایک جیسا ہو سکتا ہے؟ جواندھا بہرا ہے وہ بھٹکتا رہے گا، جگہ جگہ ٹوکریں کھائے گا اور آخر کار کسی غمین حادثے سے دوچار ہو جائے گا۔ اور جس کو اللہ نے بینائی بھی دی ہے اور سماعت بھی وہ یقیناً ایک دن کامیابی کے ساتھ اپنی منزل تک پہنچ جائے گا۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم کو دیکھنے کے لیے آنکھیں اور سننے کے لیے کان دیئے ہیں بالکل ایسے ہی انسان کے دل کو بھی دیکھنے اور سننے کی قابلیت عطا فرمائی۔ لیکن سب لوگ دل کی بصارت اور سماعت استعمال نہیں کر پاتے۔ عین ممکن ہے کہ ایک شخص آنکھوں سے دیکھ سکتا ہو لیکن اس کا دل بصیرت سے عاری ہو۔

فَإِنَّهَا لَا تَعْيَى الْأَبْصَرُ وَلَكِنْ تَعْيَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ

حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں انہی نہیں ہوتیں مگر وہ دل انہی ہے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں (سورۃ الحج: 46)

اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی آنکھوں سے انداھا ہو لیکن اس کے دل کی آنکھ کھلی ہو اور وہ حقیقت کو، حق کو اور صراط مستقیم کو صاف صاف دیکھ سکتا ہو۔ اس کی سب سے بڑی مثال رسول اللہ ﷺ کے ناپیانا صحابی حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم تھے، جو آنکھوں سے تو انہی تھے لیکن ان کا دل کئی آنکھوں والوں کی نسبت بہتر بصارت رکھتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو سیدھے راستے کی طرف ہدایت دینے کے لیے دو طرح کی آیات / نشانیاں دی ہیں، جن کا ذکر بار بار قرآن میں آتا ہے۔ ایک آیات وہ جو اللہ تعالیٰ نے کتاب کی شکل میں اپنے رسولوں پہ نازل فرمائیں اور دوسری نشانیاں وہ جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں چھپی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی نصیحت کے لیے کائنات میں بکھیر رکھا ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے سماعت عطا فرمائی وہ صرف کانوں سے قرآن کی آیات نہیں سنتا بلکہ یہ آیات اس کے دل میں اللہ کی یاد کا سبب بنتی ہیں اور وہ ان آیات سے ہدایت اور سیدھا راستہ پاتا ہے۔ اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے بصیرت عطا فرمائی وہ اللہ کی تخلیق کو صرف خاہری اور سرسری نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ دل کی آنکھ سے ان پر غور و فکر کرتا ہے۔

جو اللہ کا ذکر (یاد) کرتے رہتے ہیں کھڑے بھی بیٹھے بھی اور اپنے پہلوؤں پر بھی اور غور و فکر کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں، اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ بے مقصد تو پیدا نہیں کیا ہے تو پاک ہے (اس سے کہ کوئی عبث کام کرے) پس تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا! (سورۃآل عمران: 191)

سورۃآل عمران کی اس آیت سے پتا چلتا ہے کہ معرفت الہی تک پہنچنے کے دوراستے ہیں۔ ایک ذکر اور دوسرا فکر۔ سب سے بہترین ذکر قرآن ہے، یعنی اللہ کو یاد کرنے کا بہترین طریقہ قرآن کی آیات صرف کانوں سے نہیں بلکہ دل کی گھرائی سے سننا، سمجھنا اور ان سے ہدایت پانا ہے اور یہ ہدایت انہی کو نصیب ہوتی ہے جن کے دل کی ساعت زندہ ہو۔

اور ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بڑی توجہ سے آپ ﷺ (کی باتوں) کو سنتے ہیں۔ تو کیا آپ ﷺ بہروں کو سناسکتے ہیں چاہے وہ عقل سے کام نہ لیتے ہوں (سورۃ یونس: 42)

اور فکر کا مطلب اللہ کی تخلیق کو دل کی آنکھ سے دیکھنا اور غور کرنا ہے، اور یہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دل کو اللہ تعالیٰ نے بصیرت بخشی ہو۔

ان میں سے بہت سے لوگ ہیں جو آپ ﷺ کو (آنکھوں سے تو) دیکھتے ہیں، مگر کیا آپ ﷺ ایسے انہوں کو راہ راست بتاسکتے ہیں خواہ ان کے پاس بصیرت بھی نہ ہو؟ (سورۃ یونس: 43)

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس مثال میں فرمایا کہ جو دل کے اندر ہے بہرے ہیں وہ ساری زندگی بھکتے رہتے ہیں اور آخر جہنم کی آگ میں جا گرتے ہیں اور جو بصیرت اور ساعت رکھتے ہیں وہ جنت تک کارستہ صاف دیکھ سکتے ہیں اور جہاں کہیں بھکٹنے لگتے ہیں تو اللہ کی آیات یا نیک صحبت ان کی رہنمائی کرتی ہیں۔ اور آخر یہ لوگ اپنی منزل، یعنی جنت تک پہنچ جاتے ہیں۔ کیا یہ دلوگ ایک برابر ہو سکتے ہیں؟

دوسرے مذاہب کے بر عکس اسلام ہمیں دین کی اندر ہی پیروی نہیں سکھاتا، بلکہ قرآن ہمیں اپنی بصارت، ساعت، عقل، سوچ، سمجھ استعمال کر کے حق تک پہنچنے کی دعوت دیتا ہے۔ سچا ایمان و راشت میں نہیں ملتا بلکہ ہر شخص کو خود اپنا شعور اور تمام تر فطری صلاحیات بروئے کار لَا کر اس حقیقت تک پہنچا پڑتا ہے۔ قرآن کی اس کھلی دعوت کے باوجود ہم میں کتنے لوگ ہیں جو اللہ کی آیات کو نظر انداز کرتے ہیں۔ آئھیں اور کان ہونے کے باوجود جان بوجھ کر اندر ہے بہرے بننے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو اس دنیا میں اللہ کی آیات سے منہ موڑے گا، جان بوجھ کے انداھا بہرا بنا رہے گا، اسے قیامت کے دن بھی انداھا اٹھایا جائے گا۔

اور جو میرے ”ذکر“ سے منہ موڑے گا اس کے لئے دنیا میں تنگ زندگی ہو گی اور قیامت کے روز ہم اسے انداھا اٹھائیں گے۔ وکہے گا، ”لے میرے رب! دنیا میں تو میں آنکھوں والا تھا، یہاں مجھے انداھا کیوں اٹھایا؟“ اللہ فرمائے گا کہ ”اسی طرح ہماری آیات تمہارے پاس آئیں تو تم نے انہیں بھلا دیا، تو آج ہم تجھ کو بھلا دیں گے“ (سورۃ طہ: 124-126)

سورة الرعد

تیر بے ہدف

وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُمْ بِشَيْءٍ إِلَّا
كَبَسِطَ كَفَيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَآهُ وَمَا هُوَ بِلَغِهِ وَمَا دُعَاءُ
الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ

جو لوگ اور وہ کو اس (اللہ) کے سوا پکارتے ہیں وہ ان (کی پکار) کا کچھ بھی جواب نہیں دیتے، (یہ) ایسے ہی ہے جیسے کوئی اپنے ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے، (گویا کہ پانی سے کہ رہا ہو کہ) وہ اس کے منہ تک پہنچ جائے، (حالانکہ) وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح کافر دوں کی دعائیں بھی کچھ نہیں ہیں مگر گمراہی (جیسے ایک تیر بے ہدف!) (سورۃ الرعد: 14)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ ایک پیاسے کی مثال دیتے ہیں، جو پانی کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے اور اس سے درخواست کرتا ہے کہ وہ پانی اس کے پاس آجائے، اس کے منہ تک پہنچ جائے اور اس کی پیاس بجھ جائے۔ لیکن پانی تو بے جان اور بے شور ہے اسے کیا معلوم کر ایک پیاسا اس سے بڑی بے تابی سے کوئی درخواست کر رہا ہے۔ ناقہ پانی اس کی آواز سنتا ہے، ناسے دیکھ سکتا ہے، ناواہ اس کی پیاس کی شدت سے واقف ہے، اور ناہی اس میں کسی قسم کی کوئی طاقت یا قوت ہے کہ وہ پیاس سے تک پہنچ کر اس کی پیاس بمحادے۔ ایسا شخص چاہے ساری عمر پانی کو پکارتا ہے، گڑگڑتا ہے، اس کی آہ و بلکا اور اس کی پکار بالکل بیکار ہے۔

بھی حال ان لوگوں کا ہے جو اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کے لیے اللہ کے سوا کسی اور کوپکارتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی مدد کے لیے بتوں اور محبوسیوں کو پکارتے ہیں اور کچھ اللہ کے اولیا، رسولوں اور انبیاء کو۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سب کے سب انسان کی مدد کرنے سے قادر ہیں۔ نہ تو یہ انسان کی پکار سن سکتے ہیں، نہ ہی اس کے رنج والم سے واقف ہیں اور نہ ہی اسے کسی قسم کا کوئی نفع پہچانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ جیسے ایک شخص پیاس کی شدت میں پانی کو اپنی طرف پکارتا ہے اور پانی اس کی پیاس بجانے سے قادر ہے ایسے ہی جو لوگ غیر اللہ کو پکارتے ہیں وہ ہمیشہ محروم اور نامراد رہتے ہے۔

آخر اس شخص سے زیادہ بہکا ہوا انسان اور کون ہو گا جو اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہیں دے سکتے بلکہ وہ تو اس بات سے بھی بے خبر ہیں کہ پکارنے والے ان کو پکار رہے ہیں (سورۃ الاحقاف: 5)

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مشرکین مکہ بھی اللہ کی ذات سے واقف تھے اور اس کو اپنارب مانتے تھے لیکن ان کا شرک یہ تھا کہ وہ اپنی دعائیں اللہ تعالیٰ تک پہچانے کے لیے بتوں کا سہارا لیتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ بہت گناہ گار ہیں اور انہیں اللہ تک اپنی پکار پہچانے کے لیے ان بتوں کے وسیلے اور سہارے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اور (اے نبی ﷺ!) اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو تو وہ یقیناً یہی کہیں گے کہ اللہ نے! تو ان سے کہیں کہ ذرا غور کرو! جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا اگر اللہ نے میرے لیے کسی تکلف کا فیصلہ کر لیا ہے تو کیا وہ اس تکلیف کو دور کر سکیں گے؟ یا اگر اس نے میرے لیے رحمت کا کوئی فیصلہ کر لیا ہے تو کیا وہ اس کی رحمت کو روک سکتے ہیں؟ آپ کہہ دیجیے کہ میرے لیے تو اللہ ہی کافی ہے! اور اسی پر توکل کرتے ہیں توکل کرنے والے (سورۃ زمر: 38)

آج ہم ذرا غور کریں، کتنے مسلمان ہیں جن کی سوچ بالکل مشرکین مکہ کے جیسی ہے، جو یہی سوچتے ہیں کہ ہم عام انسان ہیں، ہماری پکار اللہ تک پہچانے کے لیے ہمیں رسولوں اور اولیا کا وسیلہ اور سہارا چاہیے۔ کوئی قبروں اور مزاروں پر سجدے کرتا ہے، کوئی اولیا

کے نام کی متین مانتا ہے، کوئی چادریں پڑھاتا ہے اور کوئی اپنی مراد پوری کروانے کے لیے مزاروں پر دیکھیں دیتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے تو قرآن میں ایک بار بھی یہ نہیں فرمایا کہ مجھ تک پہنچنے کے لیے کسی کی سفارش کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو بندے کے لیے دعا کے دروازے ہر وقت کھلے رکھے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادٌ عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الَّذِي إِذَا دَعَانِ

اور (اے نبی ﷺ!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو (ان کو بتا دیجیے کہ) میں قریب ہوں میں تو ہر پکار نے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب بھی (اور جہاں بھی) وہ مجھے پکارے
(سورۃ البقرہ: 186)

پھر بھی انسان یہ تو قوف ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر ایسوں کو پکارتا ہے جو انسان کو ایک ذرا بھر بھی نفع پہچانے پر قادر نہیں۔ عبد اللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں ایک دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سواری پر پیچھے تھا، آپ نے فرمایا:

اے لڑکے! بیٹک میں تمہیں چند اہم باتیں سکھاتا ہوں: تم اللہ کے احکام کی حفاظت کرو، وہ تمہاری حفاظت فرمائے گا، تم اللہ کے حقوق کا خیال رکھو اسے تم اپنے سامنے پاؤ گے، جب تم کوئی چیز مانگو تو صرف اللہ سے مانگو، جب تم مدد چاہو تو صرف اللہ سے مدد طلب کرو، اور یہ بات جان لو کہ اگر ساری قومیں بھی جمع ہو کر تمہیں کچھ نفع پہنچانا چاہیں تو وہ تمہیں اس سے زیادہ کچھ بھی نفع نہیں پہنچا سکتیں جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے، اور اگر وہ تمہیں کچھ نقصان پہنچانے کے لیے جمع ہو جائیں تو اس سے زیادہ کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتیں جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے، قلم الٹھا لیے گئے اور تقدیر کے صحیفے خشک ہو گئے

(جامع الترمذی: 2516)

لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ صرف اللہ کو پکارنا برحق ہے، کسی دوسرا کے سوا پکارنا یا اس پکار میں شریک کرنا باطل ہے۔ صرف اللہ ہی بندے کی دعا سنتا ہے، وہ بندے کے حالات سے پوری طرح سے واقف ہے اور مدد کرنے پر پوری طرح سے قادر ہے۔ وہ انسان کی دعا کبھی رائیگاں اور اٹھے ہوئے ہاتھ کبھی خالی نہیں جانے دیتا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

تمہارا رب بہت باحیاء اور کریم (کرم والا) ہے، جب اس کا بندہ اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتا ہے تو انہیں خالی لوٹاتے ہوئے اسے اپنے بندے سے شرم آتی ہے (سنن ابو داؤد: 1488، صحیح)



حق و باطل

نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَأَلَتْ أُوْدِيَّةٌ بِقَدَرِهَا فَأُخْتَمَ الْسَّيْلُ
 زَبَدًا رَّابِيًّا وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي الْنَّارِ أَبْتِغَاءَ حِلْيَةً أَوْ مَنَاعِ
 زَبَدٌ مِثْلُهُ كَذِلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَأَمَّا الْزَّبَدُ
 فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ كَذِلِكَ
 يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ

اللہ نے آسمان سے پانی بر سایا اور ہرندی نالہ اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا پھر
 جب سیلاب اٹھاتوں سطح پر جھاگ بھی آگیا۔ اور ایسا ہی جھاگ اُن دھاتوں پر بھی اٹھتا ہے
 جنہیں زیور اور برتن وغیرہ بنانے کے لیے لوگ پکھلایا کرتے ہیں۔ اسی مثال سے اللہ حق
 اور باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے۔ جو جھاگ ہے وہ اُڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں
 کے لیے نافع ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔ اس طرح اللہ مثالوں سے اپنی بات سمجھاتا
 ہے۔ (سورۃ الرعد: 17)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ دو مثالیں بیان فرماتے ہیں۔ ایک مثال میں آسمان سے زور دار بارش ہوئی اور تمام ندی نالے اپنی اپنی وسعت کے مطابق بہہ نکلے۔ پھر جب بارش کے بڑھنے سے پانی کے ریلے نے ایک سیلاب کی شکل اختیار کر لی تو پانی کی سطح پر جھاگ اور خس و خاشک آگیا۔ جب بھی سیلاب آتے ہیں تو کمزور درخت، پودے، جھاڑیاں اور لکڑیاں وغیرہ ٹوٹ کر جھاگ کی طرح پانی کی سطح پر آجاتے ہیں اور سیلاب انہیں اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے اور پچھے صرف مظبوط درخت اور عمارتیں باقی رہ جاتی ہیں۔

یہاں بارش سے مراد آسمان سے آنے والی وحی ہے جو نبی پاک ﷺ کے زریعے نازل ہوئی، ندی نالے سے مراد وہ سلیم الفطرت لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت کو قبول کیا، انہی اپنی وسعت کے مطابق اس سے فالدہ اٹھایا اور اسلام کی راہ پر ندی نالوں کی طرح بہہ نکلے۔ سیلاب سے مراد وہ انقلاب ہے جو اس قرآن کے زریعے سے برپا ہوا، اللہ کی آیات کا جب ایک ریلہ آیا تو حق کو قبول کرنے والے مسلمان اور باطل پر بنتے رہنے والے کفار الگ الگ ہو گئے اور کافروں کی دل کی خباشت پانی کی سطح پر آنے والے جھاگ کی طرح سب کے سامنے واضح ہو گئی۔ اس طرح حق اور باطل کا فرق صاف ظاہر ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ جھاگ اور خس و خاشک سیلاب کے ساتھ بہہ کر دور نکل جائے گا اور پچھے صرف مظبوط اور تناور درخت کھڑے رہ جائیں گے یعنی کہ حق کو قبول کرنے والے لوگ اللہ کی مدد سے زمین پر سر بلند ہوں گے، جبکہ حق کو رد کرنے والوں کا انجمام تباہ ہو کر نیست و ناید ہونا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عرب معاشرے میں اقتدار عطا فرمایا اور جزیرہ نما عرب سے کافروں کا نام و نشان مٹا دیا۔ اللہ کی کتاب اور اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی ہدایت وہ پہلا فائز ہے جو حق کو باطل سے الگ کر دیتا ہے۔

بلکہ ہم حق کو دے مارتے ہیں باطل پر تو وہ اس کا بھیجاں کال دیتا ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مت جاتا ہے (سورۃ الانبیاء: 18)

پھر دوسری مثال میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم لوگ بھٹی میں خالص دھات کو گزارتے ہو تاکہ اس سے زیور اور برتوں جیسی کار آمد چیزیں بنائی جا سکیں۔ ایسا کرنے سے ہمیشہ کچھ جھاگ اور اس کے ساتھ دھات میں موجود تمام impurities، میل کچل وغیرہ سطح پر آ جاتی ہیں اور ان سب کے الگ ہونے کے بعد پچھے صرف خالص اور کار آمد دھات رہ جاتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی آخرائش کا دوسرا مرحلہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ حق اور باطل کے فرق کو مزید واضح کر دیتے ہیں۔ یہاں بھٹی سے مراد آرما آئیں، تکلیفیں اور مشکلات ہیں جو اس لیے بھیجی جاتی ہیں تاکہ جن مسلمانوں نے اسلام قبول کرنے کا دعوه کیا، ظاہر حق کو قبول کر لیا تو ان کے ایمان کے دعوں کی سچائی کو آزمایا جاسکے۔ مدینہ میں بہت سے لوگ اور وہی دیکھا دیکھی مسلمان تو ہو گئے لیکن ان کے اندر منافقت کی بیماری چھپی تھی۔ جب انہیں جہاد اور انفاق کی بھٹی میں سے گزرنا پڑا تو ان کے دعوں کی سچائی سب کے سامنے واضح ہو گئی۔ یہ وہ دوسرا فائز تھا جس سے اللہ تعالیٰ نے مومنوں اور منافقوں کا فرق ظاہر کر دیا۔

اللہ مونوں کو اس حالت میں ہر گز نہ رہنے دے گا جس میں تم اس وقت پائے جاتے ہو (یعنی سچے اہل ایمان اور منافق سب غلط مطہر ہیں)۔ وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔ (سورۃ ال عمران: 179)

مشکل آزمائش کو عربی میں ”فتنه“ کہا جاتا ہے، فتن کا الفظی مطلب سونے کو آگ میں پکھانا ہے تاکہ کھرے اور کھوٹے کافر قوم معلوم ہو جائے۔ جیسے خالص سونے کی پیچان آگ میں تپاکر کی جاتی ہے، اگر انسان کا ایمان مظبوط ہے تو وہ آزمائشوں کی بھٹی سے گزر کر اور بھی کار آمد بن جاتا ہے۔ لیکن جس کا ایمان کمزور ہو گا وہ ذرا سی آزمائش سے گھبر اکر اللہ کے دین اور توحید سے خارج ہو جائے گا، فرار کا راستہ ڈھونڈے گا۔ ایسا شخص دھات کے اس میل کچیل کی طرح ہے جس کی حقیقت مشکل وقت آتے ہی سب کے سامنے واضح ہو گئی اور وہ جھاگ کی طرح سطح پر آگیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ فتنہ اور آزمائش بھیج کر حق اور باطل کافر قوم ظاہر کر دیتے ہیں۔

جو کافر، منافق اور مفسد لوگ ہوتے ہیں وہ جھاگ کی طرح بہہ جاتے ہیں، ضائع ہو جاتے ہیں اور پیچھے صرف نفع پہچانے والے اللہ کے مومن، صالح بندے رہ جاتے ہیں۔ یہی اللہ کی سنت رہی ہے کہ جب جب حق اور باطل کافر قوم ظاہر ہو گیا تو قوم نوح، عاد، شمود، فرعون سب تباہ و بر باد ہو گئے اور اللہ نے ایمان والوں کو زمین میں خلافت عطا فرمائی۔

وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا

اور اعلان کرو کہ ”حق آگیا اور باطل مت گیا، باطل تو مٹنے ہی والا ہے (سورۃ الاسراء: 81)

اگر ہم ان مثالوں کو انفرادی طور پر دیکھیں تو ایک انسان کے اندر بھی حق اور باطل کی جنگ جاری رہتی ہے، انسان کے نفس اور روح کی کشاکش۔ جب اس انسان تک آہمان سے آنے والی بارش کی طرح، اللہ کی وحی کا علم پہنچتا ہے تو اس کا دل ندی بالوں کی طرح ایمان سے بھرنا شروع ہو جاتا ہے۔ جیسے جیسے علم بڑھتا جاتا ہے، یہ انسان کی ذات میں ایک سیلاب کی طرح انقلاب لے آتا ہے اور انسان کے نفس کے سارے گناہ، ناپاکی اور خبائثیں جھاگ کی طرح اس کے شعور کی سطح پر آجاتے ہیں اور انسان ایک ایک کر کے اپنے نفس کا ہند کیہ کرنا شروع کرتا ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے جب اسے لگنے لگتا ہے کہ اب اس نے اپنے نفس پر قابو پالیا، اب اس کی ذات کے شہر میں صرف حق کا راج ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے ایمان کے دعوں کو test کرنے کے لیے اس پر کوئی قتنہ، کوئی آزمائش، کوئی تکلیف بھیجا ہے۔ اگر انسان پاک مومن ہو تو وہ اس بھٹی میں سے گزر کر کردن ہو جاتا ہے لیکن بعض اوقات ایسی آزمائشیں انسان کے نفس کی چھپی ہوئی ناپاکی کو ظاہر کر دیتی ہیں اور وہ پھر سے اپنے نفس کو پاک کرنے کی جدوجہد میں لگ جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا، معاشروں اور افراد کو ہر طرح کے باطل سے پاک کرنے کا طریقہ کار ہے۔ تاکہ باطل جھاگ کی طرح بہہ جائے اور حق کی بالادستی ہو۔

سورة ابراہیم

راکھ کا ڈھیر



مَثْلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِهِمْ أَعْمَلُهُمْ كَرَمًا إِشْتَدَتْ بِهِ الْرِّيحُ
فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَى شَيْءٍ ذَلِكَ هُوَ
الْضَّلَلُ الْبَعِيدُ

ان لوگوں کے اعمال کی مثال جنہوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا، ایسی راکھ کی مانند ہے جسے ایک طوفان والے دن شدید ہوا لڑائے جاتی ہے، وہ اپنی کمائی میں سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکیں گے، یہی درحقیقت سب سے بڑی گمراہی ہے۔

(سورۃ البراءۃ: ۱۸)

اللہ سبحان و تعالیٰ اس آیت میں راکھ کے ایک ڈھیر کی مثال دیتے ہیں، کہ جسے زور دار آندھی آئے اور ہوا میں ڈراؤنگ کر کے بکھیر دے۔ یہ مثال ان لوگوں کے اعمال کی ہے جنہوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا۔ اکثر جب قرآن میں کفر کی آیات آتی ہیں تو ہم مطمئن ہو جاتے ہیں، خود کو محفوظ سمجھتے ہیں کہ یہ تو کافروں کی بات ہو رہی ہے اس میں ہمارے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کس طرح کے اعمال کو کفر کہا ہے؟

پہلی قسم کا کفر اللہ کے وجود کا انکار کرنا ہے یہ ملحد (atheist) کا کفر ہے۔ پھر دوسرا کفر اللہ کے بھیج ہوئے کسی بھی رسول یا نبی کا انکار کرنا، یہ بنی اسرائیل کا کفر تھا کہ پیشک وہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے مگر انہوں نے حضرت عیسیٰ اور حضور پاک ﷺ کا انکار کر کے خود کو کفار میں شامل کر لیا۔ پھر تیسرا کفر اللہ کی ذات اور صفات میں کسی کو شریک کرنا یہ مشرکین مکہ یا عیسائیوں کا کفر تھا کہ اللہ کو جانتے ہوئے بھی وہ غیر اللہ سے مدد کے امیدوار تھے۔ چوتھا کفر اللہ کی نعمتوں کا انکار ہے، اللہ کی نعمتوں کو اللہ ہی کی نافرمانی میں استعمال کرنا کفر ان نعمت ہے اور اسے بھی اللہ نے قرآن میں کفر کہا، یہ قوم سبکا کفر تھا کہ اللہ نے انہیں نعمتیں دیں اور وہ شکر گزار نہیں بن سکے۔ اور پانچواں کفر اللہ کے حکم کا انکار ہے۔ یہ سب سے خطرناک کفر ہے، عین ممکن ہے کہ بندہ اللہ کی ذات سے واقف ہو، اللہ کا فرمابندار ہو پھر بھی ایک نافرمانی کی وجہ سے کافروں کی نہرست میں شامل ہو جائے، یہ ایلیس کا کفر تھا۔

ایلیس اللہ کا عبادت گزار جن تھا، وہ اللہ کا اس قدر فرمابندار تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے فرشتوں کے ساتھ مقام عطا کیا۔ لیکن اس کی عبادت نے اسے تکبر میں ڈال دیا اور جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو اس کا تکبر اس کی اطاعت کے آگے آ گیا، اس نے سجدے سے انکار کر دیا۔ تو بہ کرنے کے بجائے وہ اپنی نافرمانی پر جم گیا، اللہ کے ایک حکم کی نافرمانی نے اسے کافر بنا دیا۔ اس کے نیک اعمال اور ساری عبادت راکھ کے ڈھیر کی طرح ہوا میں اڑ گئی۔ کفر کی ان تمام categories جانے کے بعد ہمیں محتاط ہو جانا چاہیے کہ کہیں ہم بھی ان میں سے کسی زمرے میں شامل تو نہیں ہیں؟ کہیں یہ نہ ہو کہ کسی ناشکری، کسی شرک، کسی تکبر یا کسی نافرمانی کی وجہ سے ہمارے سارے اعمال ہوا میں راکھ بن کے اڑ جائیں۔

اور جو کچھ بھی ان کا کیا دھرا ہے اُسے لے کر ہم غبار کی طرح اڑا دیں گے۔ (سورۃ الفرقان: 23)

علماء کرام کہتے ہیں کہ اعمال کی قبولیت کی دو اہم شرائط ہیں، ایک نیت خالص اللہ کی خوشنودی ہو اور دوسرا عمل قرآن اور سنت کے مطابق ہو۔ بڑے سے بڑا کافر بھی اپنے ضمیر کی تسلی کے لیے کچھ نیک اعمال ضرور کرتا ہے، لیکن اس کے یہ اعمال اسے قیامت کے دن کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکیں گے۔ کوئی صدقہ خیرات کر دیا، کوئی ہبہ تال کھول دیا، کہیں یقین خانہ بنادیا یا پھر کتنے کافر سائمندان گزرے ہیں جن کے کام نے انسانیت کو بہت فائدہ پہنچایا۔ پھر آخر ان کے اعمال ان کے کسی کام کیوں نہیں آئیں گے؟ کیونکہ ان کے اعمال میں کفر اور شرک کا زہر ملا ہوا تھا، ان کی نیت اللہ کی رضا نہیں تھی بلکہ دنیاوی فائدے تھے۔ کوئی بھی عمل، جو اللہ کی رضا کے

سوکسی بھی اور مقصد کے لیے کیا جائے وہ رد کر دیا جائے گا، ہوا میں الٹی ہوئی راکھ کی طرح ضائع ہو جائے گا، چاہے وہ عمل کرنے والا مسلمان ہو یا کافر۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا:

تمام اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے اور ہر عمل کا نتیجہ ہر انسان کو اس کی نیت کے مطابق ہی ملے گا۔ پس جس کی بحیرت (ترک وطن) دولت دنیا حاصل کرنے کے لیے ہو یا کسی عورت سے شادی کی غرض ہو۔ پس اس کی بحیرت ان ہی چیزوں کے لیے ہو گی جن کے حاصل کرنے کی نیت سے اس نے بحیرت کی ہے۔ (صحیح البخاری: 1)

قولیت کی دوسری شرط یہ کہ عمل قرآن اور سنت کے مطابق ہو۔ مشرکین مکہ بھی اپنی طرف سے بہت نیک اعمال کیا کرتے، بتوں کی پوجا کرتے، ان کے نام کی قربانیاں دیتے، اپنے خود ساختہ طریقوں سے طواف اور حجج کرتے، صدقہ خیرات کرتے اور حاججوں کی بڑی مہمان نوازی کرتے۔ لیکن ان کی نیکیاں سب خاک ہو گئیں کیونکہ ایک تونیت خالص اللہ کی رضا نہیں تھی بلکہ ان کی نیت میں بتوں کی خوشنودی کی ملاوٹ تھی۔ اور دوسری وجہ یہ کہ ان کے اعمال قرآن اور سنت کی پہاہیت کے مطابق نہیں بلکہ ان کی اپنی سوچ سمجھ کی ایجاد تھے۔ تو ایسے اعمال کو اللہ تعالیٰ روز حساب خاک بنا کر اڑا دیے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

جس نے ہمارے دین میں از خود کوئی ایسی چیز نکالی جو اس میں نہیں تھی تو وہ رد ہے (صحیح البخاری: 2697)

لکھنے مسلمان ہیں جو ایسے اعمال میں اپنی ارزی، اپنی کوشش، اپنامال اور وقت ضائع کرتے نظر آتے ہیں جن کا اسلام سے، قرآن اور سنت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ لوگ شرک اور بداعت کو ساری زندگی نیکیاں سمجھ کر سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ ایسے اعمال قیامت کے دن انسان کے لیے محرومی اور پچھتاوے کا سبب بن جائیں گے۔ سورۃ النور میں بھی اس کی ایک بہت خوبصورت مثال ملتی ہے۔

جنہوں نے کفر کیا ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے سراب، کسی چیلیل میدان میں پیاسا سے پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ وہ جب اس کے پاس آیا تو اس نے وہاں کچھ نہ پایا بلکہ اس نے اس کے پاس اللہ کو پایا تو اس نے اس کا حساب پورا پورا چکا دیا اور اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے (سورۃ النور: 39)

یہاں ان بے ثمر اعمال کی مثال سراب سے دی گئی ہے۔ صحراء میں سخت گرمی کی شدت میں جب ریت چمکتی ہے تو دور سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پانی ہے، اسے سراب کہتے ہیں۔ جس طرح صحراء میں سفر کرنے والا پیاس سراب کو پانی سمجھتا ہے جبکہ درحقیقت وہاں کچھ بھی نہیں ہوتا بالکل ویسے ہی کفر کا ارتکاب کرنے والا اعمال کو نیکی سمجھ کر دھوکہ کھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جب وہ سراب پر پہنچتا ہے یعنی جب وہ آخرت تک پہنچتا ہے تو وہاں اللہ کو پاتا ہے۔ تب اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کی نیکیوں کی اللہ کے ہاں کوئی قیمت نہیں تھی، اس دن اللہ اس کے اعمال کا پورا پورا حساب چکا دیتا ہے۔



شَجَرَةٌ طِبِّيةٌ

(پاک درخت)

الَّمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةً أَصْلُهَا
ثَابِتٌ وَفَرِعُهَا فِي السَّمَاءِ - تُؤْتَى أَكْلُهَا كُلَّ حِينٍ يَأْذِنُ رَبِّهَا
وَيَضْرِبُ اللَّهُ أَلَّا مُثَالٌ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ

کیا تم نے غور نہیں کیا کہ کیسے اللہ تعالیٰ کلمہ طیبہ کی مثال ایک پاکیزہ درخت سے دیتا ہے؟ جس کی جڑ مضبوط اور شاخیں آسمان میں ہیں۔ جو اپنے رب کے حکم سے ہر موسم میں پھل دیتا ہے۔ یہ مثالیں اللہ اس لیے دیتا ہے کہ لوگ ان سے سبق لیں۔

(سورۃ ابراہیم: 24-25)

اس آیت میں اللہ سبحان و تعالیٰ کلمہ طیبہ (پاکیزہ بات) کی مثال ایک ایسے درخت سے دیتے ہیں جس کی جڑیں زمین میں مضبوط اور شاخیں آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اور یہ درخت سدا بہار ہے، اپنے رب کی مرضی سے ہر وقت اپنا پھل دیتا ہے، اس پر کبھی خزان نہیں آتی۔ کلمہ طیبہ سے مراد کلمہ توحید یعنی لا الہ الا اللہ اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ہر پاکیزہ بات ہے۔ اس خوبصورت مثال کے زریعے اللہ سبحان تعالیٰ ہمیں سمجھاتے ہیں کہ اس پاک کلام کا انسان کی دنیا اور آخرت پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔

اس درخت کی پہلی خوبی اس کی جڑوں کی مضبوطی ہے۔ جس طرح یہ درخت اپنی جڑوں کی بدولت زمین کی گھرائی میں مضبوطی سے جما ہوتا ہے، اسی طرح کلمہ طیبہ کی جڑیں توحید اور درست عقیدے میں پیوست ہوتی ہیں۔ یہ جڑیں ایمان اور عقائد کی وہ بنیاد ہیں جو انسان کو ہر قسم کی آزمائشوں میں قائم رکھتی ہیں۔ ایک پاکیزہ بات، درست عقیدے اور ایمان کے بنیادی اصولوں پر قائم ہوتی ہے اور انہیں سے اپنا رزق یعنی ہدایت حاصل کرتی ہے۔

اس پاک درخت کی دوسری نمایاں خصوصیت اس کی شاخیں ہیں جو زمین اور اس کی کثافتون اور پستیوں سے بہت دور آسمان کی طرف پھیلی ہوئی ہیں اور آسمان ہی سے اپنی روشنی اور قوت حاصل کرتی ہیں۔ اسی طرح ایک پاکیزہ بات ہمیشہ آسمانی وحی یعنی قرآن و حدیث سے روشنی اور رہنمائی لیتی ہے۔ یہ پاکیزہ کلام دنیا کی پستیوں اور خواہشات سے بالاتر ہے۔ جب بھی کوئی شخص دنیادی اجر کی بجائے اللہ تعالیٰ سے اجر کی امید رکھتا ہے تو اس کا کلام خود بخود پاکیزہ اور خالص ہو جاتا ہے۔ پھر یہی پاک کلمہ اللہ کے ہاں عروج پاتا ہے اور اللہ کی خوشنودی کا سبب بنتا ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الظَّيْبُ وَالْعَمَلُ
الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ

جو کوئی عزت چاہتا ہو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ عزت ساری کی ساری اللہ کی ہے۔ اُس کے ہاں جو چیز اور چڑھتی ہے وہ صرف پاکیزہ قول ہے، اور عمل صالح اس کو اپر چڑھاتا ہے (سورہ فاطر: 10)

مضبوط جڑیں اور آسمان کی طرف بلند ہوتی شاخیں اس درخت کو مضبوط بناتی ہیں اور اسے سیدھا کھڑا (upright) رکھتی ہیں، یہ طوفانوں، آندھیوں اور زمانے کے بدلتے حالات کا مقابلہ کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح، ایک پاکیزہ کلمہ نہ تو معاشرے کے بیرونی دباؤ کے سامنے جھکتا ہے نہ ہی نفس کی اندر وہی کشمکش سے اڑانداز ہوتا ہے۔ اس قول کی بدولت ایک مومن بغیر کسی سمجھوتے، بغیر کسی مصلحت یا ثیڑھ پن کے مضبوط اور سیدھے راستے پر قائم رہتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

مومن کی مثال ایسی ہے جیسے نرم پودا، جس طرف بھی ہوا چلتی ہے اس کے پتے اسی طرف جھک جاتے ہیں، لیکن جب ہوائیں رک جاتی ہیں تو وہ اپنی جگہ پر قائم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مومن آزمائشوں کو برداشت کرتا ہے۔ (صحیح البخاری: 7466)

اللہ تعالیٰ ہمیں بتاتے ہیں کہ جیسے ایک سدا بہار درخت ہر موسم میں فائدہ دیتا ہے، ویسے ہی ایک پاکیزہ کلام، جو درست عقیدے پر مبنی ہو، ہمیشہ فائدہ مند ہوتا ہے۔ ایک مضبوط اور خالص ایمان والے شخص کا کلام اور عمل ہمیشہ اپنے ارد گرد کے ماحول میں مسلسل ثابت اثرات پیدا کرتا رہتا ہے، چاہے وقت بدل جائے یا حالات کتنے بھی سخت ہوں، یہ درخت کسی بھی موسم میں اپنا چل دینا بند نہیں کرتا۔ جس طرح درخت کے پتوں، بچلوں، لکڑی اور سائے سے چرند پرند اور انسان سب فائدہ اٹھاتے ہیں، اسی طرح ایک صاحب ایمان کی بات اور عمل ہر حال میں دوسروں کو نفع پہنچاتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا قول ہے کہ :

”مومن کی مثال سمجھو کے درخت کی سی ہے۔ تم اس سے جو کچھ بھی لو گے تمہیں فائدہ ہو گا
(السلسلۃ الصحیحة: 2285)

یہ نفع صرف ایک دور تک محدود نہیں ہوتا بلکہ نسل در نسل اس کلام کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی اور وہ پیغام آج تک قائم و دائم ہے۔

اور وہ (ابراہیم) یہی کلمہ اپنے پیچھے اپنی اولاد میں چھوڑ گیا تاکہ وہ اس کی طرف (یعنی اللہ کی طرف) رجوع کریں
(سورۃ الزخرف: 28)

ہماری زندگیوں میں بھی، اگر ہم اپنے کلام اور اعمال کو قرآن و حدیث کی روشنی میں ڈھال لیں، تو وہ نہ صرف ہمارے اپنے لیے بلکہ ہمارے ارد گرد موجود بے شمار لوگوں کے لیے فائدے کا سبب بن سکتے ہیں۔ یہ پاکیزہ بات اور اعمال انسانوں کے دلوں میں محبت اور روشنی پیدا کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بلند درجات کا باعث بنتے ہیں۔ جس طرح ایک درخت کی آسیجن ہوا کو صاف کرتی ہے، اسی طرح ایک مومن کی پاکیزہ بات اور صالح عمل معاشرے کو روحاً اور اخلاقی آسودگی سے پاک کرتے ہیں۔

یہ مثال ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ کیا ہمارے الفاظ اور اعمال بھی ایسے ہی سدا بہار درخت کی مانند ہیں؟ کیا ہم دوسروں کو نفع پہنچا رہے ہیں؟ کیا ہمارے عقیدے کی جڑیں اتنی مضبوط ہیں کہ ہم حالات کے بدلتے طوفانوں کا سامنا کر سکیں؟ اس مثال کا اصل سبق یہ ہے کہ ایک مومن کا ایمان اور اس کا کلام ہمیشہ زندہ اور متحرک ہونا چاہیے، جونہ صرف دنیا میں بلکہ آخرت میں بھی کامیابی کا ضمن ہو۔



شَجَرَةُ خَبِيشَة

(خبیث درخت)

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ أَجْتَهَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا
لَهَا مِنْ قَرَارٍ

اور کلمہ خبیثہ کی مثال ایک بد ذات درخت کی سی ہے جسے زمین کے اوپر سے ہی اکھاڑ لیا
جائے اس کے لیے کوئی قرار نہیں۔ (سورۃ ابراہیم: 26)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کلمہ طیبہ کی ضد، یعنی کلمہ خبیثہ کی مثال ایک بد ذات اور ناپاک درخت سے دیتے ہیں کہ جس کی نہ توجیں مظبوط ہیں اور نہ ہی اس کی شاخیں آسمان کی طرف اٹھتی ہیں۔ کلمہ خبیثہ سے مراد ہر جھوٹی اور بے حقیقت بات جو باطل عقیدوں پر منی ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسے درخت کی جڑیں زمین کے اوپر ہی ہوتی ہیں، تھوڑے سے جھٹکے سے یہ درخت زمین سے اکھڑ جاتا ہے اور اسے کسی قسم کا قرار اور ثابت نصیب نہیں ہوتا۔ کفر و بت پرستی، شرک، بدعت، الحاد یا دہریت کے جتنے بھی دلائل ہیں ان کو جڑ سے اکھڑ دینا بہت آسان ہوتا ہے کیونکہ یہ عقیدے انسانی فطرت کے ساتھ موافقت نہیں رکھتے۔

کلمہ طیبہ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت اور قرآن و سنت پر مبنی ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ انسان کی فطرت کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے، روح کو اپیل کرتا ہے اور انسان کے دل میں پوسٹ ہو جاتا ہے۔ انسانی تاریخ میں حضرت آدم سے لے کر آج تک کلمہ طیبہ ایک ہی رہا ہے، جس کی جڑیں توحید میں پوسٹ ہیں اور اسے وقت کی آندھی اپنی جگہ سے ہلانہیں سکی۔ یہ آج بھی قائم و دائم ہے، اسے آج تک کبھی اپنی جڑ سے اکھڑا نہیں جاسکا۔ لیکن کلمہ خبیثہ کتنے آئے اور کتنے چلے گئے، تاریخ کے صفحے ایسے بے شمار عقلاء، افکار اور نظریات سے بھرے ہوئے ہیں جن کی پیروی کرنے والوں کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ کلمہ طیبہ کو اور اس کی پیروی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں ثابت قدمی اور قرار عطا فرماتے ہیں۔

يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ عَامَنُوا بِالْقَوْلِ الْشَّاِبِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ
وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ

ایمان لانے والوں کو اللہ ایک قول ثابت کی بنیاد پر دنیا اور آخرت، دونوں میں ثبات عطا کرتا ہے، اور ظالموں کو اللہ بھٹکا دیتا ہے۔ اللہ کو اختیار ہے جو چاہے کرے ” (سورۃ ابراہیم: 27)

ایک خبیث درخت کسی کے لیے فائدے کا باعث نہیں بنتا۔ اس کا سایہ ہوتا ہے، نہ پھل، نہ تھوڑا تو اس کے کانٹے زخمی کر دیں، چکمو تو کڑوا۔ یہ خود رو، بے فیض اور بے شر درخت کسی کو فائدہ نہیں پہنچاتا۔ ایسے ہی بری بات، ناپاک اور کفر و شرک پر مبنی بات سننے والے کے لیے نقصان اور تکلیف کا سبب بنتی ہے۔

یہ خود رو خبیث جھاڑیاں جہاں بھی زمین میں تھوڑی سی جگہ پاتی ہیں وہاں خود با خود آنا شروع کر دیتی ہیں اور دور دور تک تیزی سے پھیل جاتی ہیں۔ ان کو گانے کے لیے نہ تو نقیبونا پڑتا ہے نہ پانی دینا پڑتا ہے۔ بالکل ایسے ہی خبیث بات اور باطل قول جنگل کی آگ کی طرح پھیلتے ہیں، انہیں مشہور کرنے کے لیے کوشش نہیں کرنی پڑتی، نہ ہی کوئی محنت لگتی ہے بلکہ یہ خود با خود جنگلی

جھاڑیوں کی طرح پھیلتی چلی جاتی ہے۔ لوگ خبیث خیالات اور باطل عقائد کو آسانی سے قبول کر لیتے ہیں کیونکہ انسان کا نفس اور شیطان مل کر اسے برائی کی طرف مائل کرتے ہیں۔ اور پھر اکثریت کی اندر ہی تقليد اور بھیڑ چال کے نتیج میں یہ کلمہ خبیث معاشروں میں جھاڑ جھنکار کی طرح پہنچنے لگتا ہے۔

وَإِنْ تُطْعِنُ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضْلُلُوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ

اور اگر تم پیروی کرو گے زمین میں میںے والوں کی اکثریت کی، تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے لازماً گراہ کر دیں گے
(سورۃ الانعام: 116)

اس کے برعکس ایک طیب درخت لگانے کے لیے بہت محنت درکار ہوتی ہے، بیچ بونا، پانی دینا اور سالوں تک سینچنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر ایک تناول درخت بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں اکثریت ہمیشہ باطل کی پیروی کرتی نظر آتی ہے۔ پچی اور پاک بات کرنے والے اور اس کی تصدیق کرنے والے کہیں کہیں کہیں ملتے ہیں۔

قُلْ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيرُ وَالظَّيْبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيرِ

(اے بنی اسرائیل) کہہ دیجیے کہ ناپاک اور پاک برادر نہیں ہو سکتے، چاہے ناپاک شے کی کثرت تمہیں کتنی ہی اچھی لگے (سورۃ المائدہ: 100)

اللہ تعالیٰ ہمیں اسی مثال میں ایک خوشخبری بھی دیتے ہیں کہ خبیث بات پیش دور در تک پھیل جاتی ہے، خود رو جھاڑیوں کی طرح لوگوں کے دلوں میں گھر بھی کر لیتی ہے اور اپنی ظاہری کثرت اور پھیلاو کے باعث طاقتوں بھی نظر آتی ہے، لیکن ایسی بات کو کسی فقتم کا کوئی ثابت یا تقریر نہیں ہوتا۔ اگر اس کو اکھانے والا ہاتھ موجود ہو تو اسے جڑ سے اکھانے میں بہت زیادہ محنت درکار نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ و فیما فوقاً ایسے ہاتھ پیدا کرتا رہتا ہے جو حق کی طاقت سے زمین کو ان ناپاک اور خبیث جھاڑیوں سے پاک کرتے رہتے ہیں۔ پاکیزہ بات ہمیشہ قائم رہتی ہے جبکہ باطل کا سراب جلد ہی اپنی حقیقت کھو دیتا ہے۔ آج بھی جھوٹے نظریات اور عقائد آتے ہیں، اپنی چمک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں، اور آنے والے کل میں ان کا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے دین کو اور حق کو قائم رکھتا ہے، اور باطل کو مٹا دیتا ہے، چاہے وہ کتنا ہی پھیلا ہو اور طاقتوں کیوں نہ لگے۔

سورۃ النحل

مالک اور غلام



صَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا عَبْدًا مَمْلُوكًا لَا يَقْدِرُ عَلَى شَيْءٍ وَمَنْ رَزَقَنَاهُ مِنَ
رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَجَهْرًا هَلْ يَسْتَوْنَ ۝ الْحَمْدُ لِلَّهِ
بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ

الله نے ایک غلام کی مثال بیان کی جو کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتا، اور (اس کے مقابلے میں) ایک شخص ہے جسے ہم نے اپنی طرف سے بہترین رزق عطا کیا اور وہ اس میں سے چھپ کر اور علانیہ خرچ کرتا ہے۔ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، لیکن ان میں سے اکثر لوگ (یہ حقیقت) نہیں جانتے۔ (سورۃ النحل: 75)

اللہ سبحان و تعالیٰ دو طرح کے انسانوں کا موازنہ کرتے ہیں۔ پہلا وہ شخص ہے جو کامل طور پر غلامی کی زندگی گزار رہا ہے، اپنے مالک کی مرضی کے بغیر کچھ بھی کرنے پر قادر نہیں۔ اور دوسری طرف وہ شخص ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بہترین رزق عطا فرمایا ہے، یہ شخص کسی کاغلام نہیں بلکہ کامل طور پر با اختیار ہے اور وہ اپنے رزق میں سے خفیہ اور علانیہ خرچ کرتا ہے۔

اس مثال کو مفسرین نے دو طریقے سے سمجھا ہے۔ کچھ علماء کرام کی رائے میں یہ مثال شرک کی نفعی اور مشرکین کی نادانی کی نشاندہی کرنے کے لیے نازل ہوئی۔ کہ ایک طرف تو یہ غلام ہے جو اپنے مالک کی مرضی کے بغیر کچھ بھی کرنے پر قادر نہیں۔ اگر وہ کسی کی مدد کرنا بھی چاہے تو پھر بھی وہ کسی بھوکے کو ایک لقمہ روٹی دینے کا بھی اختیار نہیں رکھتا۔ اپنے مالک کی اجازت کے بغیر نہ کچھ کما سکتا ہے نہ کسی کو کچھ بھی دینے کی قدرت رکھتا ہے۔ دوسری طرف ایک آزاد شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے خزانوں میں سے بے شمار رزق دیا ہے اور وہ اپنی مرضی سے اس کو جہاں چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔ اب اگر کوئی ضرورت مند ہو تو وہ اپنی حاجت روائی کے لیے کس کے پاس جائے گا؟ غلام کے پاس یا مالک کے پاس؟

اللہ تعالیٰ نے اس مثال کے ذریعے مشرکین کی بیوقوفی کی نشاندہی کی ہے کہ وہ اللہ کو چھوڑ کر اپنے خود ساختہ معبدوں کو اپنی ضرورتیں بتاتے ہیں اور حاجت روائی کی امید بھی رکھتے ہیں۔ چاہے یہ معبدوں بت ہوں، دیوتا ہوں، اللہ کے ولی، انبیا اور رسول ہوں یا فرشتے ہوں، یہ سب کے سب اللہ کی مخلوق اور اللہ کے عبد ہیں۔ اللہ کی مرضی کے بغیر ایک پتہ ہلانے پر بھی قادر نہیں۔ فرشتے تک کسی کی مدد کرنے کے لیے اللہ سبحان و تعالیٰ کے حکم کا انتظار کرتے ہیں اور اگر اللہ کا حکم نہ ہو تو اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے۔ دوسرے طرف اللہ ہے زمین و آسمان کے خزانوں کا مالک، وہ بھی ہے اور جس کو چاہتا ہے اپنی مرضی سے نوازنے کا مکمل اختیار رکھتا ہے۔ پھر بھی لوگ اللہ کو چھوڑ کر مخلوق سے سوال کریں تو یہ سراسر نادانی ہے۔

إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ

یقیناً اللہ ہی سب کو رزق دینے والا (الرَّزَّاق) ہے۔ بڑی قوت والا بردست ہے (سورۃ الذاریات: 58)

دوسری جانب بعض علماء کرام کی رائے میں، جن میں حضرت ابن عباس رضی تعالیٰ عنہ بھی شامل ہیں، یہ مثال اللہ اور جھوٹے معبدوں کی نہیں بلکہ ایک کافر اور مومن کی ہے۔ اس مثال میں مملوک دراصل اپنے نفس کا غلام ہے، وہ اپنی نفس کی زنجیروں میں اس طرح سے جکڑا ہوا ہے کہ وہ اللہ کی دی ہوئی کسی بھی صلاحیت یا نعمت کو اللہ کی راہ میں صرف کرنے سے قاصر ہے۔ اور دوسری طرف ایک شخص جو با اختیار ہے، اپنے نفس کی غلامی سے آزاد ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے رزق میں فضیلت بھی عطا فرمائی ہے۔ یہ شخص اللہ کے دیے ہوئے اس رزق میں سے خفیہ اور علانیہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ کیا اللہ کی نظر میں کفران نعمت کرنے والا اور اللہ کا شکر گزار مومن بندہ برابر ہو سکتے ہیں؟

سورہ نحل میں اللہ تعالیٰ نے بار بار ہماری توجہ اس بات کی طرف دلائی ہے کہ کس طرح اُس کی ہر مخلوق اپنی قابلیت کے مطابق اللہ کے حکم کو بجالا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کو، مویشیوں کو، زمین آسمان اور درختوں کو جو بھی کام دیے وہ ان کاموں کو بڑی فرمانبرداری سے سر انجام دے رہے ہیں۔ ہر مخلوق اللہ کی دی ہوئی صلاحیت اور قابلیت کو اُس کی مرضی کے مطابق استعمال کر رہی ہے اور وہ اُس کی اطاعت میں ذرا بھی لاپرواہی نہیں کرتی۔ لیکن انسان ایک ایسی مخلوق ہے کہ اللہ اسے بے شمار نعمتوں سے نوارتا رہتا ہے اور اس کے باوجود انسان اللہ کی نافرمانی، کفر اور ناشکری پہ ڈلتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سورہ نحل میں ہی فرماتے ہیں:

وَإِنْ تَعْدُوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُخْصُوهَا إِنَّ اللَّهَ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ

اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گناہ پا ہو تو گن نہیں سکتے، حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی در گزر کرنے والا اور رحیم ہے
(سورہ النحل: 18)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں الحمد للہ، یعنی تمام تعریف اور شکر اس اللہ کا ہے جس نے ہمیں اپنی نعمتیں عطا فرمائیں۔ لیکن اللہ کی دی ہوئی فضیلوں اور نعمتوں کا اصل شکر اور حمد صرف لفظوں سے نہیں بلکہ عمل سے ہے۔ ایک شخص جسے اللہ نے رزق میں فضیلت دی اس کے لیے اللہ کی شکر گزاری کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ وہ اس رزق کو اللہ کی راہ میں دن رات خرچ کرے۔ یہاں رزقاً حنا سے مراد صرف مال و دولت نہیں بلکہ ہر طرح کی نعمتیں ہیں صحت، وقت، جوانی، اولاد، مال و دولت، علم، حکمت، ٹیلنٹ وغیرہ سب رزق ہے۔ اور ان تمام نعمتوں کا شکر تب ہی ادا ہوتا ہے اگر بنہ اپنی تمام تر صلاحیتیں، قوتیں اور ارزی بی اللہ کی خوشبوتوں میں خرچ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کو رزق میں فراوانی عطا فرمائی تو کہا:

أَعْمَلُوا لَعَالَ دَاؤُدْ شُكْرًا وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِي الْشَّكُورُ

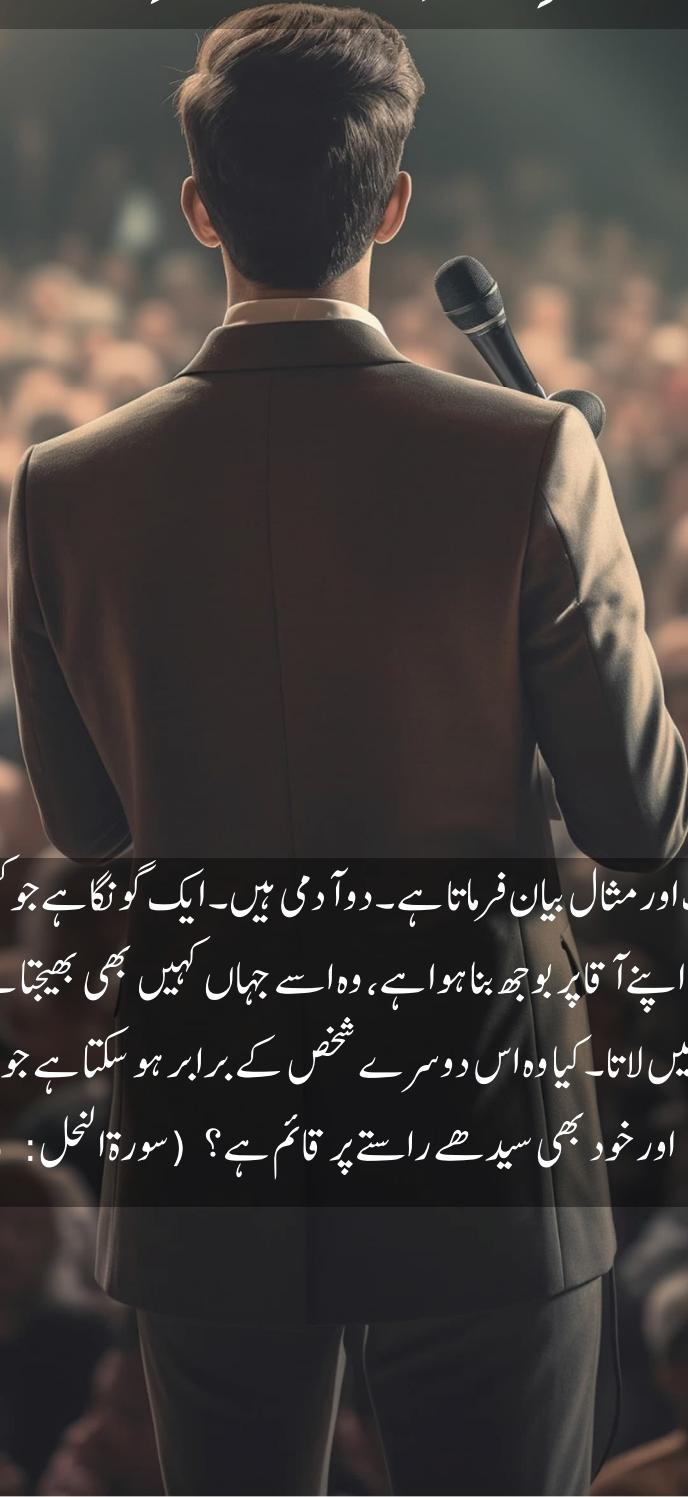
اے داؤد کے گھر والو! عمل کرو شکر ادا کرنے کی خاطر اور (حقیقت یہ ہے کہ) میرے بندوں میں شکر کرنے والے کم ہی ہیں۔ (سورہ سبا: 13)

الْحَمْدُ لِلَّهِ بَلْ أَنْشُرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ اس آیت کے اختتام میں ہماری توجہ دو انتہائی اہم مضامین کی طرف دلوائی گئی ہے، یعنی تمام تعریف یعنی اللہ کے لیے ہیں، لیکن ان میں سے اکثر لوگ (یہ حقیقت) نہیں جانتے۔ یہاں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اللہ کی تعریف انسانوں کے اعتراض پر مشروط نہیں ہے۔ وہ اپنی ذات میں کامل اور لا تَقْ حمد ہے، چاہے لوگ اس کو تسلیم کریں یا نہ کریں۔ یہ اللہ کی بے نیازی اور عظمت کو بیان کرتا ہے کہ اس کی شان میں کوئی کمی نہیں آتی چاہے لوگ ایک با اختیار مالک کے طرح اس کی حمد کریں یا بے وقف غلام کی طرح اسے فراموش کر دیں۔

گونگا اور دائی



وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ أَحَدُهُمَا أَبْكَمٌ لَا يَقْدِرُ عَلَى شَيْءٍ وَهُوَ
كَلٌّ عَلَى مَوْلَاهُ أَيْنَمَا يُوَجِّهُ لَا يَأْتِ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِي هُوَ وَمَنْ
يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ



الله تعالى ایک اور مثال بیان فرماتا ہے۔ دو آدمی ہیں۔ ایک گونگا ہے جو کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتا بلکہ وہ اپنے آقا پر بوجہ بنانا ہوا ہے، وہ اسے جہاں کہیں بھی بھیجتا ہے وہ کوئی ڈھنگ کا کام کر کے نہیں لاتا۔ کیا وہ اس دوسرے شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو عدل کا حکم دیتا ہے اور خود بھی سیدھے راستے پر قائم ہے؟ (سورۃ النحل: 76)

بچپلی مثال کی طرح اس آیت میں بھی اللہ سبحان و تعالیٰ دو طرح کے لوگوں کی مثال دیتے ہیں۔ ایک شخص جونہ صرف غلام ہے بلکہ پیدائشی گونگا ہے، اور اس سے بھی بڑھ کے لا یقیناً علیٰ ہئی یعنی کہ وہ کچھ بھی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ چلو اگر ایک شخص بول نہیں سکتا تو عام طور پر اس میں کوئی اور ہنر یا صلاحیت ہو سکتی ہے، اگر کوئی اور ہنر نہیں تو کم از کم جسمانی طاقت ہی ہو کہ کوئی بوجھ اٹھا کر اپنے آقا کے لیے کچھ مفید ثابت ہو سکے۔ لیکن یہاں یہ غلام توہر لحاظ سے بے کار، کمزور اور بے اختیار ہے۔ اگر اس کا آقا اسے کسی کام کی ذمہ داری دے بھی دے تو یہ اسے صحیح طریقے سے سرانجام دینے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ جہاں بھی اس کا آقا اسے کام سے بھیجتا ہے وہ اس کے لیے مایوسی کا سبب بنتا ہے۔ دوسری طرف ایک آزاد اور باصلاحیت انسان ہے جسے اللہ نے ہدایت بھی دی ہے اور وہ اس قابلیت کو دنیا میں عدل و انصاف قائم کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ وہ لوگوں کو بھی سیدھا راستہ دکھاتا ہے اور خود بھی صراط مستقیم پر قائم ہے۔ کیا یہ دونوں ایک جیسے ہو سکتے ہیں؟

اس آیت کی بھی مفسرین نے دو طرح سے تشریع کی ہے۔ بہت سے مفسرین کے خیال میں یہ مثال اللہ اور جھوٹے معبدوں کا فرق بیان کر رہی ہے۔ یعنی یہ جھوٹے معبدوں کے بیان یا اولیاً کی قبریں اور مزار ہوں، یہ نہ تو تمہاری پکار سننے کی صلاحیت رکھتے ہیں، نہ جواب دینے پر قادر ہیں، اور نہ ہی تمہیں کسی قسم کا فائدہ پہچانے کا اختیار رکھتے ہیں۔ بچپلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے غلام کی بے اختیاری کی طرف اشارہ کیا کہ وہ آقا کی مرضی کے بغیر اگرچاہے بھی تو کسی کی مدد نہیں کر سکتا۔ اس مثال میں غلام کی صفات کی نشاندہی ہے کہ اگر آقا کوئی کام اس کے سپرد کر بھی دے تو یہ غلام اپنی کمزوری اور معذوری کی وجہ سے یہ کام پورا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ اللہ اور ان معبدوں میں فرق صرف اتنا ہی نہیں کہ ایک با اختیار مالک ہے اور دوسرا بے اختیار غلام ہے کہ شاید اگر اسے اختیار دے دیا جائے تو وہ مدد کر سکے بلکہ مسئلہ صفات کا ہے۔ یہ جھوٹے معبدوں تمہاری بات سننے اور جواب دینے کی، یا تمہاری حاجت کو پورا کرنے کی صلاحیت اور قابلیت ہی نہیں رکھتے۔ اس غلام کی تو پوری زندگی کا انعام خود آقا پر ہے، اگر آقا کوئی کام اس پر چھوڑ بھی دے تو یہ اس کو پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

لوگ بتوں، دیوتاؤں اور قبروں پر جاتے ہیں، ان سے رزق مانگتے ہیں جبکہ اللہ الرَّزَّاقُ ہے، ان سے اولاد مانگتے ہیں جبکہ اللہ الْوَهَّابُ ہے، ان سے شفایا مانگتے ہیں جبکہ اللہ الشافی ہے، اپنے مسائل کا حل طلب کرتے ہیں جبکہ اللہ القادر ہے، ان سے مدد مانگتے ہیں جبکہ یہ جھوٹے معبدوں کسی قسم کی مدد کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے۔

لوگوں نے اسے (اللہ کو) چھوڑ کر ایسے معبد بنایا ہے جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں، جو خود اپنے لیے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے اور نہ ہی انہیں اختیار ہے موت کا نہ زندگی کا، نہ ہی یہ کسی مرے ہوئے کو پھر اٹھائے ہیں (سورۃ الفرقان: 3)

کیا یہ جھوٹے معبدوں کے مقابل ہو سکتے ہیں؟ اللہ انسانوں کو عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے، سیدھا راستہ دکھاتا ہے، صراط مستقیم کی طرف ہدایت دیتا ہے، حق اور باطل کا فرق بتاتا ہے۔

ان سے پوچھو تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو حق کی طرف را ہنمائی کرتا ہو۔ کہو وہ صرف اللہ ہے جو حق کی طرف را ہنمائی کرتا ہے۔ پھر بھلا بتاؤ جو حق کی طرف را ہنمائی کرتا ہے وہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود را نہیں پاسکتا لایہ کہ اس کی رہنمائی کی جائے۔ آخر تجھیں کیا ہو گیا ہے، کیسے اللہ اکٹھ فصلے کرتے ہو (سورۃ یونس: 35)

اللہ سید ہی را کی طرف ہدایت بھی دیتا ہے اور خود بھی اس کا ہر فصلہ، ہر حکم، حرام و حلال، سزا و جزا سب مکمل عدل و انصاف اور حق پر مبنی ہے۔ اللہ نہ صرف سید ہمار است و کھاتا ہے بلکہ وہ خود بھی صراطِ مستقیم پر ہے یعنی وہ جو کچھ کرتا ہے صحیح کرتا ہے۔ اس کا ہر کام سید ہا ہے۔ اس کے ہاں انہیں نہیں ہے بلکہ وہ سراسر حق اور عدل کے ساتھ خدائی کر رہا ہے

إِنَّ رَبِّيْ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ

یقیناً میرا رب تو سید ہی را ہ پر ہے (سورۃ ھود: 56)

دوسری تشریح حضرت ابن عباسؓ سے منسوب ہے جن کے مطابق یہ کافر اور مومن کی مثال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو صرف اور صرف ایک مقصد کے لیے پیدا کیا، اور وہ اللہ کی مکمل بندگی اور عبودیت۔

میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں
(سورۃ الداریات: 56)

اگر اللہ کا کوئی عبد اپنے اصل مقصد کو فراموش کر دے تو اللہ کے نزدیک اس کی مثال اس گونگے غلام کی سی ہے، جو کہ مفت کی روٹیاں توڑ رہا ہے، اپنے حصے کا رزق تو پورا کھاتا ہے، دنیا میں اپنے حصے کا دعوے دار ہے لیکن ایسا شخص زمین پر بوجھ ہے، چاہے وہ دنیاوی لحاظ سے جتنی بھی ترقی کر لے لیکن اللہ کے نزدیک اُس کا وجود ایک سر اپا مایوسی ہے۔ اس کے بر عکس اللہ کا مومن بندہ ہے جو اپنی ذمہ داری کو سمجھتا ہے، جہاں جاتا ہے لوگوں میں عدل و انصاف قائم کرتا ہے، اپنی زبان کو اللہ کی طرف دعوت دینے کے لیے استعمال کرتا ہے، صرف نیکی کا حکم دیتا نہیں بلکہ خود بھی صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رہتا ہے۔

وَمَنْ أَحْسَنْ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَ إِلَىٰ اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ

اور اس شخص سے بہتر بات اور کس کی ہوگی جو اللہ کی طرف بلائے اور وہ (خود بھی) نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں (سورۃ الفصل: 33)



دیوانی عورت

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقْضَتْ غَرْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَثَتَتَّ خِذْلَوْنَ
أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَنْ تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أُرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ إِنَّمَا
يَبْلُو كُمْ أَلَّهُ بِهِ وَلَيَبْيَنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَا كُنْتُمْ فِيهِ
تَخْتَلِفُونَ

تمہاری حالت اس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے آپ ہی محنت سے سوت کاتا اور پھر آپ ہی اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ تم اپنی قسموں کو آپس کے معاملات میں مکروفریب کا ہتھیار بناتے ہو تو اکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ کر فائدے حاصل کرے۔ حالانکہ اللہ اس عهد و پیمان کے ذریعہ سے تم کو آزمائش میں ڈالتا ہے، اور ضرور وہ قیامت کے روز تمہارے تمام اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا۔ (سورۃ النحل: 92)

اللہ سبحان و تعالیٰ ایک ایسی عورت کی مثال دیتے ہیں جو بڑی محنت سے سوت کاتی ہے، دن رات محنت کرتی ہے اور جب کاتا ہوا سوت مظبوط ہو جاتا ہے تو وہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے اسے ادھیر کرتا تار کر دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو عورت بھی ایسا کرے گی اسے سب احمد اور دیوانہ ہی کہیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص بھی بڑے جوش و خروش اور مظبوط ارادے سے وعدے کرے، قسمیں کھائے اور پھر بعد میں خود ہی اپنے عہد کو تار کر ڈالے تو اس کا حال بھی اسی دیوانی عورت جیسا ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن میں بار بار مسلمانوں کو اپنے وعدوں کی پابندی کا حکم دیتے ہیں۔ اس سورۃ میں دو طرح کے وعدوں کا ذکر ہے۔ ایک وہ عہد جو انسان نے اللہ کے ساتھ کیا اور دوسرا، وہ عہد جو ایک انسان یا گروہ دوسرے انسان یا گروہ کے ساتھ کرے۔ اس سے پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اور اللہ کے عہد کو پورا کرو جب کہ تم عہد کر چکے ہو اور اپنی قسموں کو مت توڑو مضبوطی سے باندھنے کے بعد جبکہ تم اللہ کو اپنے اوپر گواہ ٹھہر اپنے ہو یقیناً اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو (سورۃ النحل: 91)

اللہ کا عہد وہ وعدہ ہے جو ہم نے عالم ارواح میں اللہ تعالیٰ سے کیا تھا، بندگی اور عبودیت کا وعدہ۔

اور اے نبی لوگو کو یاد دلاؤ وہ وقت جب کہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتون سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا ”کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟“ انہوں نے کہا ”ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں، ہم اس پر گواہی دیتے ہیں۔“ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ ”ہم تو اس بات سے بے خبر تھے“ (سورۃ الاعراف: 172)

اسے عہد است کہتے ہیں، یہ وعدہ ہماری روح کی یاد اشت میں تازہ ہے۔ اس دنیا میں آنے کے بعد، اس کی چکاچوند میں انسان اتنا مگن ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا ہوایہ وعدہ بالکل فراموش کر دیتا ہے۔ پھر دنیا میں آنے کے بعد جب ہم لا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ کہتے ہیں تو یہ بھی ایک وعدہ ہے، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا وعدہ۔ جب جب انسان اللہ کی نافرمانی کرتا ہے، کفر اور شر ک میں پڑتا ہے، گناہ اور بغاوت کی طرف جاتا ہے تو وہ اللہ سے کیا ہوایہ وعدہ تار کر دیتا ہے۔ بالکل اس دیوانی عورت کی طرح جس نے محنت سے سوت کاتا اور پھر خود ہی اسے ادھیر دیا۔

دوسری قسم کا وعدہ جسے وفا کرنے کا اللہ تعالیٰ نے بار بار حکم دیا ہے وہ ایسے عہد اور قسمیں ہیں جو ایک انسان دوسرے انسان سے، ایک قوم دوسری قوم سے یا ایک ملک دوسرے ملک سے کرتے ہیں۔ ویسے توہر قسم کے عہد کی پابندی لازم ہے لیکن خاص طور پر ایسے عہد جن پر اللہ تعالیٰ کو گواہ بنایا جائے ان کا پورا کرنا فرض کا درجہ رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قسمیں کھا کر، بڑے بڑے معاہدے کر کے محض ذاتی مفاد کے لیے، ایک دوسرے کے ساتھ کمر، فریب اور دھوکہ نہ کرو۔ یعنی جب تم نے کسی قوم یا کسی گروہ کے ساتھ معاہدہ کیا تو اس وقت تم کمزور تھے اور وہ طاقتوں تھے، لیکن اب جب تم ان سے زیادہ طاقتوں ہو گئے تو تم نے اپنا عہد توڑ دالا۔ یا پھر پہلے تم نے کسی شخص یا کسی گروہ کے ساتھ پکا وعدہ کر لیا، اس پر قسمیں بھی کھائیں اور جب تمہیں اس سے زیادہ طاقتوں گروہ نے پیش کی تو تم نے اپنا پہلا عہد توڑ دالا۔ اللہ کے نزدیک یہ سراسر دیوالگی اور بیو قوئی ہے۔ ہر عہد اور وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ہوئی آزمائش ہے جس کے بارے میں روز قیامت سوال کیا جائے گا۔

وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْءُولًا

عہد کی پابندی کرو، بیک وعدوں کے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا (سورہ الاسراء: 34)

اب یہ وعدے چاہے ملکوں کے درمیان بڑے بڑے تحریری معاہدے ہوں یا پھر انسانوں کے درمیان صرف زبانی کلامی عہد، اللہ تعالیٰ ہر قسم کے وعدے کے بارے میں انسان سے سوال کرے گا۔ ایک مسلمان کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات اس کے لیے ایک معاہدے کی حیثیت رکھتی ہے جس کی پابندی لازم ہے اور جس کی خلاف ورزی اللہ کی نفرت کی وجہ بن سکتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا إِنَّمَا تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ - كَبُرُّ مَقْتَنًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ
تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔ (سورہ الصاف: 2-3)

نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ پکا وعدہ کر کے توڑنا منافقت کی نشانی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

منافق کی علامتیں تین ہیں۔ جب بات کرے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے اور جب اس کو امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔ (صحیح البخاری: 33)

سورة الحج

شرک کا انجام - زلت اور پستی

حُنَفَاءِ لِلَّهِ غَيْرَ مُشْرِكِينَ بِهِ وَمَنْ يُشْرِكُ بِاللَّهِ فَكَانَ مَا خَرَّ مِنَ
السَّمَاوَاتِ فَتَخُطَّفَهُ الْطَّيْرُ أَوْ تَهُوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ

اللہ کے بندے بنو اور خالصتاً اسی کے ہو جاؤ، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا وہ آسمان سے گر گیا، اب یا تو اسے پرندے اچک لے جائیں گے یا ہوا اس کو کسی دور دراز جگہ پر لے جا کر پھینک دے گی

(سورۃ الحج: 31)

اس مثال میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مکمل طور پر اللہ کی طرف یکسو ہو جاؤ، باقی ہر طرح کی سوچ، تعصباً اور تصورات کو چھوڑ کر ایک اللہ کے بندے بن جاؤ۔ شرک کرنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے انسان آسمان سے یعنی کسی بلند مقام سے یا کسی پہاڑ کی چوٹی سے پستیوں کی طرف گرجائے۔ آسمان سے مراد وہ روحانی اور فطری بلندی ہے جس پر انسان توحید کی بنیاد پر فائز ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر انسان کسی بھی قسم کے شرک میں پڑ جائے، چاہے وہ ظاہری شرک ہو یا شرک خفی۔ چاہے انسان اللہ کی عبادت میں شرک کرے یا عبودیت میں، اس کی ذات میں یا صفات میں، دعا میں، توکل میں یا محبت میں، ہر طرح کا شرک انسان کو پستیوں میں دھکیل دیتا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَنَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ - ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ

ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ پھر (جب اس نے نافرمانی کارستہ اختیار کیا) تو ہم نے لوٹا دیا اس کو پست ترین حالت کی طرف (سورۃ انتیں: 4-5)

پھر اللہ تعالیٰ اس مثال کو مزید بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب یہ شخص اونچائی سے پستیوں کی طرف گرنا شروع ہوا تو اس کا انجام کیا ہو گا؟ کیا اس کے بچنے کا کوئی امکان ہے؟ یا تو راستے میں ہی کوئی شکاری پرندہ اس پر جھپٹ کر اسے دبوچ لے گا اور اس کی بویاں نوچ کھائے گا۔ یا پھر تیز ہوا اس شخص کو کہیں دور مقام پر لے جا کر پھینک دے گی۔ دونوں حالتوں میں اس کے لیے یقینی ہلاکت ہے۔

یہاں پرندوں سے مراد شیاطین ہیں، چاہے وہ انسانوں میں سے ہوں یا جنات میں سے، جو ہر وقت اس تک میں رہتے ہیں کہ کب انسان کے قدم توحید سے لڑ کھڑائیں اور وہ فوراً اس پر جھپٹ پڑیں۔ موقع کا فالدہ اٹھا کر اسے اپنے وسوسوں میں دبوچ لیں اور اس کے ایمان کی دھیان بکھیر دیں۔ شیطان انسان کا کھلاد شمن ہے، اس کا کام انسان کو ہلاک کرنا ہے اور وہ ہمیشہ ایک شکاری جانور کی طرح انسان کی گھات میں رہتا ہے۔ ذرا انسان توحید سے بھکتا ہے، شیطان اسی لمحے انسان پر حملہ کرتا ہے کیونکہ اس نے پہلے دن سے انسان کو تباہ و بر باد کرنے کا عزم کیا ہوا ہے۔

اس نے کہا (پروردگار!) تو نے جو مجھے (آدم کی وجہ سے) گمراہ کیا ہے تو اب میں لازماً تیری سیدھی راہ پر ان کے لیے گھات لگا کر بیٹھوں گا۔ (سورۃ الاعراف: 16)

اس مثال میں دوسرا انجام یہ ہے کہ ہوا اس شخص کو کسی دور دراز مقام پر لے جا کر پھینک دے گی۔ ہوا انسان کے نفس اور اس کی خواہشات کا استغفار ہے۔ جب انسان اپنی خواہشات کے پیچھے گلتا ہے اور اللہ کی ہدایت کو چھوڑ دیتا ہے، تو یہ خواہشات اس کو اس

طرح قابو کر دیتی ہیں جیسے اُٹا ہوا پتہ ہوا اُں میں بے سمت ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اصل بچپان اور مقصد کھو دیتا ہے، اور نفس کی غلامی میں مگن ہو جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں نفسانی خواہشات کو "ھوا" کہا گیا ہے کیونکہ نفس کی پیروی انسان کو اس کے اختیارات اور شعور سے محروم کر دیتی ہیں۔ اس بے بس اور لاچار انسان کی اپنی کوئی مرضی نہیں رہتی، وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے اور بس اپنے خواہشات نفس کی پیروی کرتا ہوا پیسوں کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔

أَفَرَعَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهًا هَوَنَهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ
وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ غَشَّوَةً فَمَنْ يَهْدِيهِ مِنْ بَعْدِ اللَّهِ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ

پھر کیا تم نے کبھی اُس شخص کے حال پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا اور اللہ نے علم کے باوجود اُسے گمراہی میں پھینک دیا اور اُس کے دل اور کانوں پر مُسر لگادی اور اُس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا؟ اللہ کے بعد اب اور کون ہے جو اسے ہدایت دے؟ کیا تم لوگ کوئی سبق نہیں لیتے؟ (سورۃ الجاثیہ: 23)

سُجِّيق کا لفظ سُخت سے نکلا ہے جس کے اصل معنی پینے کے ہیں۔ کسی جگہ کو سُجِّيق اُس صورت میں کہیں گے جبکہ وہ اتنی گہری ہو کہ جو چیز اس میں گرے وہ پاش پاش ہو جائے۔ یہاں فکر و اخلاق کی پستی کو اس گہرے گڑھے سے تشبیہ دی گئی ہے جس میں گر کر آدمی کے پُر زے اُڑ جائیں۔ (مولانا مودودی)

پیروی اور بندگی اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں ڈال کر پھیجی ہے۔ اگر تو وہ اللہ کی یکسوئی سے بندگی قبول کر لے تو اللہ اسے توحید کی بدولت بلندیاں عطا فرماتا ہے۔ لیکن جو انسان اللہ کی بندگی کا انکار کرتا ہے وہ بہر حال کسی ناکسی کی غلامی ضرور قبول کرتا ہے۔ یا تو وہ شیطان کا بندہ بن جاتا ہے، اور اس کے نقش قدم پر چلانا شروع کر دیتا ہے یا پھر وہ اپنے نفس کا غلام بن کر پیسوں کی گہری کھائی میں گر جاتا ہے۔ ہر حال میں تباہی اور بر بادی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَغَنَهُ بِهَا وَلَكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَأَنْبَعَ هَوَلَهُ

اور اگر ہم چاہتے تو ان آیتوں سے اس (کے درجے) کو بلند کر دیتے مگر وہ تو پستی کی طرف مائل ہو گیا اور اپنی خواہش کے پیچے چل پڑا۔ (سورۃ الاعراف: 176)

طالب و مطلوب

(ایک کمھی)



يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَن يَخْلُقُوا ذَبَابًا وَلَوْا جُنَاحَتَهُ وَإِنْ يَسْلُبُهُمُ الذَّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَنِقُذُوهُ مِنْهُ ضَعْفَ الطَّالِبِ وَالْمَطْلُوبِ



اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے پس اسے ذرا توجہ سے سنو یقیناً (تمہارے وہ معبود) جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو یہ اس سے وہ چیز چھڑانہیں سکتے کس قدر کمزور ہے طالب بھی اور مطلوب بھی۔ (سورۃ الحج: 73)

ایک نہایت ہی گھری اور فطرت سے جڑی ہوئی خوبصورت مثال کے زرعی اللہ سبحان و تعالیٰ شرک کی حقیقت کو واضح فرماتے ہیں کہ اے انسانوں! اللہ کو چھوڑ کر تم جن کو پکارتے ہو، جن سے مدد کی امید رکھتے ہو، جنہیں اپنا مشکل کشا سمجھتے ہو۔ چاہے وہ بت ہوں، دیوی دیوتا ہوں، فرشتے، انبیا یا اولیاء اللہ ہوں یا پھر کوئی بھی جھوٹے سہارے جن کو ہم دنیا میں اپنا حاجت رو اور مدد گار سمجھ بیٹھے ہیں، وہ سب اگر مل بھی جائیں تو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ زمین، آسمان، سورج، چاند، ستارے، سمندر، پہاڑ، فرشتے، جن اور انسان تو ایک طرف، ایک چھوٹی سی مکھی بھی ان کے لیے اس قدر پیچیدہ اور نفیس مخلوق ہے کہ اگر یہ سارے کے سارے جھوٹے معبود اپنی تمام صلاحیتیں اور طاقتیں جمع کر لیں تب بھی وہ ایک مکھی تک پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔

أَفَمَنْ يَخْلُقُ كَمْ لَا يَخْلُقُ إِنَّا لَنَذَّكَرُونَ

تو کیا وہ (اللہ) جو پیدا کرتا ہے ان کی طرح ہے جو (کچھ بھی) پیدا نہیں کر سکتے؟ تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے
(سورۃ النحل: 17)

پھر ان کی مزید بے بسی یہ کہ تخلیق کرنا تو بہت دور کی بات ہے، اگر ایک مکھی ان کے سامنے رکھی ہوئی کوئی چیز اچک لے جیسے منت کا دودھ مٹھائی یا حلوہ، جو تم ان بتوں کے سامنے پیش کرتے ہو، ان کے نام کی دلکشیں چڑھاتے ہو، نذر نیاز دیتے ہو، تو یہ جھوٹے معبود اس قدر کمزور ہیں کہ وہ اس مکھی سے اپنی وہ چیز بھی واپس نہیں لے سکتے۔ صرف بت ہی نہیں بلکہ اس دنیا کے بڑے بڑے فرعون اور ظالم حکمران بھی، جو خود کو بہت طاقتور سمجھتے ہیں، جن کے درباروں کے باہر لوگ اپنی فریادیں لیے کھڑے رہتے ہیں، جن سے مدد کی امید رکھتے ہیں اور انہیں اپنا حاجت رو امامتے ہیں، اگر یہی مکھی، اللہ کی معنوی سی مخلوق، ان کے کھانے سے کچھ چرا لے جائے تو یہ بڑے بڑے بادشاہ، سلطان اور حاکم بھی اس مکھی کے آگے بے بس ہیں۔

ضَعُفَ الظَّالِئُ وَالْمَطْلُوبُ كُسْ قَدْرَ كَمْزُورٍ هُوَ طَالِبٌ بَھِيْ وَ مَطْلُوبٌ بَھِيْ۔ اس ایک جملے سے اللہ تعالیٰ نے انسان کی نفیات کی حقیقت کھول دی ہے، کہ انسان کسی کو اپنا معبود کیوں مانتا ہے۔ انسان بیشک اشرف المخلوقات ہے لیکن فطری، جذباتی اور جسمانی طور پر نہایت کمزور ہے۔

وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا

اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے (سورۃ النساء: 28)

انسان اپنی کمزوری کی تلاشی کے لیے ہر وقت کسی نہ کسی سہارے کی تلاش میں رہتا ہے۔ کبھی وہ بتوں کی پوجا کرتا ہے، کبھی مزاروں پر جا کر ماتھا لیکرتا ہے، کبھی کسی پیر و مرشد کے درپر مرید بن جاتا ہے۔ کبھی وہ اپنی ناقلوں اور کمزوری کے مدارے کے لیے دولت کا سہارا لیتا ہے، کبھی شہرت کا، کبھی اپنے ارد گرد کے لوگوں اور رشتتوں کا۔ انسان کسی ناکسی شے کو اپنا مطلوب بنالیتا ہے۔ جبکہ انسان کا واحد محبوب و مطلوب ہونے کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا يُجْبِونَهُ كَحْبُ اللَّهِ وَالَّذِينَ
عَامَنُوا لَأَشَدُ حُبًّا لِلَّهِ

اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر کچھ اور چیزوں کو اس کا ہمسر اور م مقابلہ بنادیتے ہیں وہ ان سے ایسی محبت کرنے لگتے ہیں جیسی اللہ سے کرنی چاہیے اور جو لوگ واقعاً صاحب ایمان ہوتے ہیں ان کی شدید ترین محبت اللہ کے ساتھ ہوتی ہے (سورۃ البقرہ: 165)

جب انسان اپنے مطلوب کو اللہ کے علاوہ کسی اور میں ڈھونڈتا ہے تو وہ خود کو مزید کمزور اور بے بس بنالیتا ہے۔ ضَعْفَ الطَّالِبِ وَالْمُطْلُوبُ، طالب بھی کمزور اور مطلوب بھی کمزور۔ جب مطلوب ہی کمزور اور بے بس ہو تو وہ طالب کو قوی کیسے بناسکتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ پہاڑ کی چوٹی سے گرتا ہو اکوئی شخص کسی کمزور شاخ کو تحام لے تو یہ شاخ کتنی دیر اس کا وزن برداشت کرے گی، بہت جلدی یہ سہاراٹ جائے گا اور انسان کی ہلاکت کا سبب بن جائے گا۔ لیکن جس نے اللہ کو اپنا سہارا، اپنا مطلوب بنا لیا تو اللہ اپنے بندے کو کبھی ضائع نہیں ہونے دیتا۔

فَمَنْ يَكُفُرُ بِالْظَّاغُوتِ وَيُؤْمِنُ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى لَا إِنْفِصَامَ
لَهَا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلَيْمٌ

توجہ کوئی بھی طاغوت (غیر اللہ) کا انکار کرے اور پھر اللہ پر ایمان لائے تو اس نے بہت مضبوط کنڈ اتحام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے اور اللہ سب کچھ سنتے والاسب کچھ جاننے والا ہے (سورۃ البقرہ: 256)

سورة النور

روشن چراغ



اللَّهُ نُورٌ أَلْسَوْتِ وَالْأَرْضِ مَثَلُ نُورٍ هُوَ كَمِشْكُوٰةٌ فِيهَا مِصْبَاحٌ
 الْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ الْزُّجَاجَةُ كَانَهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِنْ
 شَجَرَةٍ مُّبَرَّكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَا شَرْقِيَّةٌ وَلَا غَرْبِيَّةٌ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ
 وَلَوْلَمْ تَمَسَّسْهُ نَارٌ نُورٌ عَلَى نُورٍ يَهْدِي اللَّهُ لِنُورٍ هُوَ مَنْ يَشَاءُ
 وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَلَ لِلنَّاسِ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اس کے نور کی مثال ایسے ہے جیسے ایک طاق، اس (طاق) میں ایک روشن چراغ ہے، وہ چراغ شیشے (کے فانوس) میں ہے اور وہ شیشہ ایک چکدار ستارے کی مانند ہے، وہ (چراغ) جلا یا جاتا ہے زیتون کے ایک مبارک درخت سے جونہ شرتی ہے اور نہ غربی، قریب ہے کہ اس کا روغن (خود بخود) روشن ہو جائے چاہے اسے آگ نے ابھی چھوا بھی نہ ہو، روشنی پر روشنی، اللہ ہدایت دیتا ہے اپنے نور کی جس کو چاہتا ہے اور اللہ یہ مثالیں بیان کرتا ہے لوگوں (کی راہنمائی) کے لیے جبکہ اللہ توہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ (سورۃ النور: 35)

یہ آیت، آیت نور کمالاتی ہے، جس میں اللہ سجان و تعالیٰ انسان کے ایمان کو بہت خوبصورت مثال سے بیان فرماتے ہیں۔ سب سے پہلے فرمایا کہ اللہ آسمانوں اور زمین کا یعنی پوری کائنات کا نور ہے۔ نور سے مراد روشنی، جس میں سب کچھ صاف نظر آنے لگے، راستہ دکھنے لگے اور چیزوں کی حقیقت واضح ہو جائے۔ اس کے بر عکس اندھیرا، ظلمت اور تاریکی ایسی حالت کو کہتے ہیں جس میں انکھیں ہونے کے باوجود انسان کچھ دیکھنے پائے، رستہ بھائی نہ دے اور انسان بھٹک جائے۔ اللہ کائنات کا نور ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ اللہ ہی واحد روشنی کا ذریعہ (source of light) ہے۔ جو شخص اللہ کو نہیں مانتا، اللہ کے بارے علم نہیں رکھتا اس کے لیے یہ پوری کائنات، عالم ظلمات ہے۔ ایسا انسان نہ اپنے خالق کے بارے میں جانتا ہے، نہ دنیا اور اس کی حقیقت سے واقف ہے اور نہ ہی وہ اپنے مقصد حیات کو سمجھ پاتا ہے، پس وہ ساری عمر اندھیروں میں بھکٹتا پھرتا ہے۔ اور جو اللہ تک پہنچ گیا، جس نے اللہ کی معرفت حاصل کر لی، اللہ پر اس کی تمام تر صفات کے ساتھ ایمان لے آیا تو اس کے لیے دنیاروشن ہو گئی، اب وہ اس ایمان اور ہدایت کے نور میں سب کچھ واضح دیکھ سکتا ہے، اس کے لیے سچائی اور حق کا راستہ صاف ظاہر ہو گیا۔

أَوْ مَنْ كَانَ مَيِّتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْسِي بِهِ فِي الْنَّاسِ كَمَنْ مَمْلُهُ
فِي الظُّلْمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا

کیا وہ شخص جو چہلے مُردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اجائے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں (بھٹک رہا) ہوا ہو اور کسی طرح ان سے نکل ہی نہیں پاتا؟ (سورۃ الانعام: 122)

پھر اللہ سجان و تعالیٰ ایک مومن کے دل میں اس نور ایمان کی مثال دیتے ہیں۔

مَثَلُ نُورٍ إِكْشِكَوٰةٌ فِيهَا مُضَبَّاحٌ: جیسے ایک طاق ہے اور اس طاق میں ایک روشن چراغ ہے۔ مشکوہ، طاق کو کہتے ہیں، جو دیوار میں خاص طور پر چراغ رکھنے کے لیے بنائی جاتی ہے۔ طاق ایک طرف سے کھلی اور باقی اطراف سے بند ہوتی ہے، چراغ کو اس میں اس لیے رکھا جاتا ہے تاکہ روشنی آسانی سے ہر طرف پھیل سکے۔ اس مثال میں چراغ سے مراد انسان کا دل اور طاق سے مراد انسان کا سینہ ہے۔ انسان کا صدر (سینہ) بھی سلیوں کی وجہ سے ایک طاق کی طرح دکھتا ہے۔ جس میں اللہ نے انسان کا دل رکھا ہے، جو اگر نور ایمانی سے منور ہو جائے تو انسان کا پورا وجود روشن ہو جاتا ہے، اور اس چراغ کی روشنی اس کے ظاہر و باطن تک پھیل جاتی ہے۔

أَلْيُضَبَّاحُ فِي زُجَاجَةٍ أَلْزُجَاجَةُ كَانَهَا كَوْكَبٌ دُرْسٌ: یہ چراغ ایک شیشے کے اندر بند ہے، جیسے لاثین میں چراغ کے اور گرد شیشہ ہوتا ہے۔ اور یہ شیشہ چمکدار ستارے کی مانند ہے۔ یہ شیشہ وہ فطرت سلیمہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا، اگر

فطرت سلیم ہو تو ہدایت کی روشنی سیدھی دل تک پہنچ کر اس چراغ کو روشن کر دیتی ہے۔ لیکن انسان اپنے گناہوں سے اس شیشے کو داغ دار کر دیتا ہے، اور اگر یہ شیشہ میلا اور گدلا ہو تو نہ ہدایت کی روشنی دل تک پہنچ پاتی ہے اور نہ اس چراغ کے نور سے اس کے ماحول میں روشنی پھیلتی ہے۔ اس فطرت کے شیشے کو پاک صاف رکھنا ہی تذکیرہ قلب کملاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نکتہ پڑ جاتا ہے، پھر جب وہ گناہ کو چھوڑ دیتا ہے اور استغفار اور توبہ کرتا ہے تو اس کے دل کی صفائی ہو جاتی ہے (سیاہ دھبہ مت جاتا ہے) اور اگر وہ گناہ دوبارہ کرتا ہے تو سیاہ نکتہ مزید پھیل جاتا ہے یہاں تک کہ پورے دل پر چھا جاتا ہے (جامع ترمذی: 3334)

یُوقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبَرَّكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيَّءُ وَلَوْلَمْ تَمْسَسْهُ تَأْزِّ : اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہے نہ غربی، جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکنے کے لیے تیار ہو چاہے اسے آگ نے ابھی چھوٹا بھی نہ ہو۔ مبارک تیل سے مراد انسان کی روح ہے جو اسے اشرف الخلوقات بناتی ہے۔ یہی وہ روح ہے کہ جب اللہ نے حضرت آدم میں پھونگی توفیر شتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ یہ روح نہ شرقی ہے نہ غربی، بلکہ یہ آفاقی ہے، آسمان سے آئی ہے اور آسمان کی طرف ہی لوٹ جانے والی ہے۔ یہ روح اپنے رب سے بندگی کا وعدہ کر کے آئی ہے، حق اس کی یاداشت کا حصہ ہے اور یہ ایسے شفاف اور مبارک زیتون کے تیل کی طرح ہے جو ہر دم ہدایت کی روشنی سے بھڑک اٹھنے کے لیے تیار ہے۔

نُورٌ عَلَىٰ نُورٍ : انسان کے دل میں پہلے ہی روح ہے جس میں ہدایت کا نور موجود ہے۔ اسے مبارک کہا گیا یعنی کثیر المنافع، بہت سے فائدوں کی حامل۔ پھر جیسے ہی اللہ کی وحی اور ہدایت کا نور اس روح تک پہنچتا ہے تو انسان کا دل اس علم کی آگ سے بھڑک اٹھتا ہے۔ روشنی پر روشنی، نور پر نور۔ اگر فطرت کا شیشہ صاف اور چمکدار ہو تو ہدایت کا نور دل تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ نہیں آتی، اور جب دل کا چراغ جعل اٹھے تو انسان کا پورا وجود پر نور ہو جاتا ہے اور پھر اس کی ذات کی روشنی سے اس کے ارد گرد ہر کوئی فائدہ اٹھاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنے نور تک پہنچا دیتا ہے۔ اللہ کی ہدایت کا نور صرف اسے ملتا ہے جو اس کا خواہ ششد ہو، جو اس کے لیے کوشش کرے اور جو اپنی فطرت کے شیشے کو گناہوں کے میل کچیل سے پاک رکھے۔

وَمَنْ لَمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِنْ نُورٍ

اور جس کو اللہ نے ہی کوئی نور عطا نہ کیا ہو تو اس کے لیے کہیں کوئی نور نہیں ہے (سورۃ النور: 40)

سراب



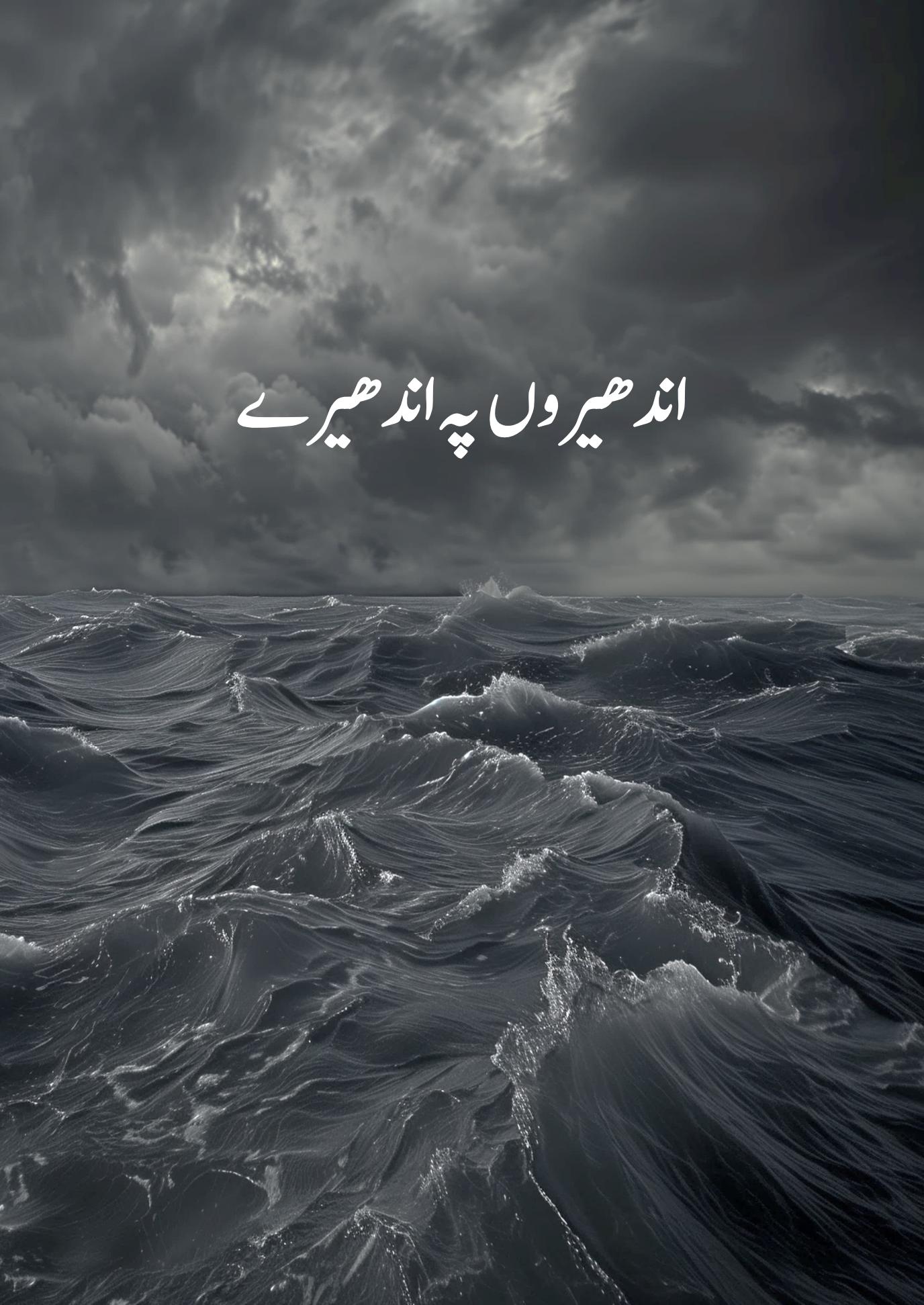
وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَلُهُمْ كَسَرَابٌ بِقِيَعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمَآنُ مَاءً
حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدُهُ شَيْئًا وَوَجَدَ اللَّهَ عِنْدَهُ قَوْفَلَهُ حِسَابٌ
وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ

ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے دشت بے آب میں سراب کہ پیاساں کو پانی سمجھے ہوئے تھا، مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا، بلکہ وہاں اس نے اللہ کو موجود پایا، جس نے اس کا پورا پورا حساب چکا دیا، اور اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی۔

(سورة النور: 39)

(تفصیل کے لیے دیکھیں سورۃ ابراھیم: 18)

اندھیروں پہ اندھیرے



أَوْ كَظْلِمَتٌ فِي بَحْرٍ لَّجِيْعٍ يَغْشَلُهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهِ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهِ
سَحَابٌ ظَلَمَتْ بَعْضَهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكُنْ يَرَلَهَا
وَمَنْ لَمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ شُورًّا فَمَا لَهُ مِنْ نُورٍ

یا پھر اس کی مثال گھرے سمندر میں انڈھیر وہ کی مانند ہے، جس پر ایک کے بعد دوسرا ہر چڑھی ہوا اور اس کے اوپر گھرے بادلوں کا سایہ ہو، الغرض انڈھیرے ہیں جو اور پر تلے پے درپے ہیں۔ آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھنے پائے۔ جسے اللہ نور نہ بخشے اُس کے لیے پھر کوئی نور نہیں۔ (سورۃ النور: 40)

بچپل آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک پیاسے کی مثال دی جو صحر امیں سراب کو پانی سمجھ رہا ہے۔ یہ ایسا شخص ہے جو کم از کم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے لیے کچھ نہ کچھ عمل بھی کرتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ اس کا عمل آخرت میں اس کے کام آئے گا لیکن اُس دن اس کا تمام عمل ضائع ہو کر راکھ کا ڈھیر بن جائے گا کیونکہ یا تو اس کے عمل میں مخلصانہ نیت کی کمی تھی یا پھر اس کا عمل قرآن اور سنت کے مطابق نہیں تھا۔ اور اس وجہ سے اس کا عمل قبول نہیں کیا گیا۔ اس بات کی وضاحت ہم سورۃ ابراہیم آیت 18 میں کر چکے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی مثال دیتے ہیں جو آخرت پر عقیدہ ہی نہیں رکھتے اور نہ ہی ان میں کسی قسم کے نیک عمل کی خواہش موجود ہے، چاہے وہ کافر ہوں یا نام نہاد مسلمان۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کی مثال گھرے سمندر میں غرق انسان کی سی ہے، بخڑا لجی سے مراد ایک بہت گھر اسمندر ہے۔ سمندر میں جوں جوں گھرائی میں جاؤ اندھیر ابڑھتا چلا جاتا ہے۔ پھر اگر اس پر تہ با تہ لہریں چلی آ رہی ہوں تو تاریکی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اور اگر اس کے اوپر گھرے بادل بھی ہوں تو تاریکی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں تین طرح کے اندھیروں کا ذکر فرمایا: سمندر کا اندھیرا اور تیسرا بادلوں کا اندھیرا۔ یہ شخص بھی تین طرح کی ظلمتوں میں گرفتار ہوتا ہے۔ سمندر کے اندھیرے سے مراد وہ گمراہ عقلائد کی تاریکی ہے جس میں یہ لوگ مکمل طور پر ڈوب چکے ہیں۔ پھر موجودوں سے مراد وہ برے اعمال ہیں جو یہ لوگ ہٹ دھرمی کے ساتھ سرانجام دیتے چلتے ہیں، اور جس طرح لہریں ایک پر ایک چڑھی آتی ہیں اور سمندر کو مزید پر خطر بنا دیتی ہیں، اسی طرح ہر برا عمل ان کو تاریکیوں کی طرف دھکلیتا چلا جاتا ہے۔ اب قیمت کا قول ہے کہ

”گناہ انسان کے دل میں تاریکی کا باعث بنتے ہیں۔ اللہ کی اطاعت روشنی ہے اور اللہ کی نافرمانی تاریکی ہے۔ جب اندھیر ابڑھتا ہے تو الجھنیں بڑھ جاتی ہیں، یہاں تک کہ انسان بدعت اور گمراہی کی راہ پر اندھا ہو کر چلنے لگتا ہے، جس طرح ایک نایباً شخص رات کو اکیلا چلتا ہے“

اس طرح انسان کا دل اپنے گناہوں کی وجہ سے تاریک ہوتا چلا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ

ہر گز نہیں، بلکہ دراصل ان لوگوں کے دلوں پر ان کے برے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔ (سورۃ المطفیں: 14)

بادلوں سے مراد برے ماحول کی تاریکی ہے، اگر انسان کاماحول اور صحبت اچھی ہو تو بھی کوئی روشنی اور ہدایت کی امید ہوتی ہے لیکن جب ماحول میں بھی اندر ہیرا اور بے راہ روی ہو پھر روشنی کی کوئی امید باقی نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان اندر ہیروں کی موجودگی تاریکی کو اس قدر بڑھادیتی ہے کہ اگر انسان اپنا ہاتھ بھی دیکھنا چاہے تو نہیں دیکھ سکتا۔ حالانکہ ہاتھ، جسم کا وہ حصہ ہے جسے انسان اپنی آنکھوں کے سب سے قریب لا سکتا ہے اور دیکھنے کے لیے کوئی خاص کوشش نہیں کرنی پڑتی۔ لیکن جب گمراہ عقائد، بد اعمالی اور بری صحبت کی تاریکیاں دلوں کو اس حد تک ڈھانپ لیں تو انسان کو خود اپنی حقیقت بھی دکھائی نہیں دیتی۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ أُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ

اور (اے مسلمانو! دیکھنا!) تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔ یہی لوگ ہیں جو فاسق ہیں (سورۃ الحشر: 19)

ظُلْمَتُ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ: اندر ہیرے ہیں جو اپر تلے پے در پے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آیت نور میں ایک مومن کے دل کی مثال دیتے ہوئے فرمایا نُورٌ عَلَى نُورٍ، یہاں ایک کافر کا معاملہ بالکل اس کے بر عکس ہے، جو ظلمات اور تاریکیوں میں ڈوبتا ہے۔ اپر تلے اندر ہیرے ہی اندر ہیرے۔ اور اس کے لیے روشنی ہو بھی کیسے سکتی ہے جس نے اللہ پر ایمان لانے سے انکار کیا۔ اللہ نُورٌ الْسَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ اس پوری کائنات میں اللہ کی ذات ہی واحد روشنی کا منہبہ ہے، جس نے اللہ کا انکار کیا گویا اس نے روشنی کا انکار کیا۔ جسے اللہ نور نہ بخشدے اس کے لیے پھر کوئی نور نہیں۔

**اللَّهُ وَإِلَيْهِ الْذِينَ عَامَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلْمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا
أُولَئِكَ هُمُ الظَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُم مِنَ النُّورِ إِلَى الظُّلْمَاتِ أُولَئِكَ أَصْحَابُ
النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ**

جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا ولی (حامی اور مددگار) اللہ ہے۔ اور وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کا حامی و مددگار طاغوت ہے۔ اور وہ انہیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ یہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے۔ (سورۃ البقرۃ: 257)

سورة العنكبوت

مکڑی کا جالہ



مَثَلُ الَّذِينَ أَتَخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ أُولَيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنكَبُوتِ
أَتَخَذَتْ بَيْتًا وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبَيْوَاتِ لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ لَوْ كَانُوا
يَعْلَمُونَ

جو لوگ اللہ کے سواد و سروں کو اپنا ولی (دوست، مددگار یا سرپرست) بناتے ہیں، ان کی
مثال مکٹری کی سی ہے، جو اپنے لیے ایک گھر بناتی ہے، حالانکہ سب گھروں میں کمزور ترین
گھر مکٹری کا ہی ہوتا ہے، کاش وہ جانتے۔ (سورۃ العنكبوت: 41)

سورۃ العنكبوت میں اللہ تعالیٰ ایک کر کے تاریخ کی مختلف قوموں کا ذکر کرتے ہیں، جن کے پاس اللہ کے نبی آئے لیکن وہ کفر اور شرک پر ہٹ دھرمی کے ساتھ جمعے رہے۔ اور آخر ان تمام قوموں کا ایک ہی انجام ہوا، تباہی اور بر بادی۔ چاہے وہ قوم عاد ہو یا ثمود، قوم لوط یا قوم شعیب، یا قوم فرعون، جس قوم نے اللہ کی واحد انبیت کا انکار کیا وہ صفحہ ہستی سے مت گئی۔ یہ قومیں شرک میں بنتا تھیں اور اپنے بتوں اور جھوٹے معبدوں کو اپنا حامی اور مددگار سمجھتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے یہ معبدوں ان کو ہر نقصان سے بچائیں گے۔ لیکن جب اللہ کی طرف سے ان کی بر بادی کا فیصلہ آگیا، تو نہ ان کے معبدوں نہ کوئی دیوتا اور نہ کوئی اور چیز ان کے کچھ کام آسکی۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے عقائد کی مثال مکڑی کے جال سے دیتے ہیں جو اپنی ناپسیداری اور کمزوری میں بے مثال ہے۔ مکڑی کتنی محنت سے، تانا بانا بنتی ہے، اپنا گھر بناتی ہے، اس امید پر کہ اس کا گھر سردی، گرمی، بارش، آندھی اور دشمن کے حملے سے اس کی حفاظت کرے گا۔ لیکن مکڑی کا گھر اس کی کسی امید پر پورا نہیں اترتا، اس کا گھر اس قدر کمزور ہوتا ہے کہ انگلی کے ایک اشارے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ بالکل ایسے ہی شرک میں بنتا انسان اپنی امیدوں کا گھر و ندا بنتا ہے، اللہ کو چھوڑ کر اپنی امیدیں غیر اللہ سے جوڑتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ جھوٹے سہارے اس کی حفاظت کرنے اور اسے نقصان سے بچانے پر قادر ہیں۔ لیکن جیسے مکڑی کا جلا ہوا کے ایک جھونکے سے ٹوٹ جاتا ہے ایسے ہی ان کی امیدیں اور توقعات بھی اللہ کے ایک حکم سے پاش پاش ہو جاتی ہیں۔

قُلِ ادْعُوا اللَّذِينَ زَعَمْتُم مِّنْ دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الظُّرُرِ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا

ان سے کہو، پکار دیکھو ان معبدوں کو، جن کو تم خدا کے سوا (اپنا کار ساز) سمجھتے ہو، وہ کسی تکلیف کو تم سے نہ ہشا
سکتے ہیں نہ بدل سکتے ہیں (سورۃ الاسراء: 56)

انسان اپنی زندگی میں مختلف حالات میں اللہ کو چھوڑ کر کئی قسم کے سہارے تلاش کرتا ہے۔ کبھی وہ بتوں اور جھوٹے دیوتاؤں سے مدد مانگتا ہے، کبھی مزاروں، پیروں اور فقیروں سے فریاد کرتا ہے۔ کبھی مادی سہاروں پر تکلیف کرتا ہے کہ شاید اس کا مال و دولت، اس کا بزرگ، اس کی نوکری، اس کا گھر، اس کے social connections یا پھر اس کے اثر و رسوخ والے رشتے دار اسے نقصان سے بچانے اور اسے فائدہ پہچانے پہ قادر ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا ہر سہارا مکڑی کے جالے کی طرح کمزور ہے۔ صرف اللہ کا ہی ایک سہارا ہے جو مظبوط اور قابل اعتبار ہے۔ یہ دنیاوی سہارے اور جھوٹے معبدوں انسان کو وقتی طور پر تسلی دے سکتے ہیں، مگر جب آزمائش کا وقت آتا ہے، تو یہ سب ناکام ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی طاقت، دولت، یا انسان کسی کو نقصان سے نہیں بچا سکتے، نہ ہی وہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

قُلْ أَفَرَعَيْتُمْ مَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ أَرَادَنِي اللَّهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كَاشِفَاتُ
 ضُرًّا أَوْ أَرَادَنِي بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكَاتُ رَحْمَتِهِ قُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ عَلَيْهِ
 يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُونَ

تو (اے نبی ﷺ) ان سے کہیے کہ ذرا غور کرو! جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا اگر اللہ نے میرے لیے کسی تکلیف کا فیصلہ کر لیا ہے تو کیا وہ تمہارے معبدوں (اس تکلیف کو دور کر سکیں گے؟ یا اگر اس نے میرے لیے رحمت کا کوئی فیصلہ کر لیا ہے تو کیا وہ اس کی رحمت کو روک سکتے ہیں؟ آپ کہہ دیجیے کہ میرے لیے تو اللہ ہی کافی ہے! اور اسی پر توکل کرتے ہیں توکل کرنے والے (سورۃ الزمر: 38)

جیسے مکڑی دیر لگا کر، محنت سے اتنا پچیدہ گھر بناتی ہے، بالکل ایسے ہی شرک میں بتلا انسان اپنے دماغ میں جھوٹی توقعات اور امیدوں کا ایک تانا بانا بن لیتا ہے۔

بتوں سے تجوہ کو امیدیں، خدا سے نامیدی

مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے!

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سواری پر پیچھے تھا، آپ نے فرمایا:

اے اڑکے! بیٹک میں تمہیں چند اہم باتیں بتلارہا ہوں: تم اللہ کے احکام کی حفاظت کرو، وہ تمہاری حفاظت فرمائے گا، تم اللہ کے حقوق کا خیال رکھو اسے تم اپنے سامنے پاؤ گے، جب تم کوئی چیز مانگو تو صرف اللہ سے مانگو، جب مدد چاہو تو صرف اللہ ہی سے مدد طلب کرو، اور یہ بات جان لو کہ اگر ساری انسانیت بھی جمع ہو کر تمہیں کچھ نفع پہنچانا چاہے تو وہ تمہیں اس سے زیادہ کچھ بھی نفع نہیں پہنچا سکتی جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے، اور اگر وہ تمہیں کچھ نقصان پہنچانے کے لیے جمع ہو جائے تو اس سے زیادہ کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتی جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے، قلم اٹھا لیے گئے اور (تقریر کے) صحیفے خشک ہو گئے ہیں۔

(جامع الترمذی: 2516)

سورة الروم
براہر کے شریک؟



ضَرَبَ لَكُمْ مَثَلًا مِنْ أَنفُسِكُمْ هَلْ لَكُمْ مِنْ مَا مَلَكَتُ أَيْنَنْكُمْ
مِنْ شُرَكَاءَ فِي مَا رَزَقْنَاكُمْ فَأَنْتُمْ فِيهِ سَوَاءٌ تَخَافُونَهُمْ
كَخِيفَتِكُمْ أَنفُسَكُمْ كَذَلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ



اللہ تمہیں تمہاری اپنی زندگیوں سے ایک مثال دیتا ہے: کیا تم اپنے علاموں کو اس مال میں شریک اور برابر کا حصہ دار بنانی لیتے ہو جو ہم نے تمہیں دیا ہے؟ اور کیا تم ان سے اسی طرح ڈرتے ہو جیسے آپس میں ایک دوسرے سے ڈرتے ہو؟ اسی طرح ہم اپنی نشانیاں ان لوگوں کے لیے واضح کرتے ہیں جو سمجھ رکھتے ہیں۔ (سورۃ الردوم: 28)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں **ضَرَبَ لَكُمْ مَثَلًا مِنْ أَنْفُسِكُمْ** اللہ تعالیٰ تمہیں خود تمہاری ذات میں سے مثال دیتا ہے۔ یعنی یہ ایکی بات ہے جو تمہارے اپنے تجربات سے بالکل قریب ہے، جسے سمجھنے کے لیے تمہیں کسی گھرے فلفے یا کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ سوالیہ انداز میں فرماتے ہیں کہ اگر تمہارے پاس کچھ غلام انوکر ہیں تو کیا تم انہیں اپنے مال و دولت میں برابر کا شریک بنانا پسند کرو گے؟ کیا تم یہ چاہو گے کہ تم اور تمہارے غلام انوکر حیثیت میں ایک برابر ہو جائیں؟۔ ظاہر ہے کوئی بھی ایسا نہیں چاہے گا کہ اس کا غلام یا نوکر اس کے مال میں برابر کا حصہ دار اور شریک بن جائے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس طرح تو اسکی اپنی حیثیت کی نفعی ہو جائے گی۔ اسی طرح تم اپنے غلاموں انوکروں کے بارے میں ایسے فکر مند یا محتاط نہیں ہوتے جیسے تم اپنے کاروباری شرکت داروں یا برابری والوں کے بارے میں ہوتے ہو، کہ اگر تم نے ان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو وہ ناراض ہو جائیں گے یا تنازع کھڑا ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ اس مثال کے ذریعے مشرکین کے دوہرے معیار کو بے نقاب کرتے ہیں کہ اپنے مال میں تو انہیں اپنے غلاموں کی شرکت برداشت نہیں، حالانکہ وہ مال بھی اللہ کا دیا ہوا ہے، لیکن اللہ، جوز میں و آسمان کا مالک ہے، اس کی سلطنت میں دوسروں کو شریک بنانے میں انہیں کوئی ہچکچاہت نہیں ہوتی۔ اسی بات کو اللہ تعالیٰ سورۃ النحل میں بیان فرماتے ہیں:

**وَأَللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا أَنْدَلَ الَّذِينَ فُضِّلُوا لِبِرَادِي رِزْقِهِمْ
عَلَىٰ مَا مَلَكُتُ أَيْمَنُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ أَفَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ**

"اللہ نے تم میں سے بعض کو رزق میں دوسروں پر فضیلت دی ہے۔ لیکن جنہیں زیادہ دیا گیا ہے، وہ اپنا مال اپنے غلاموں کے ساتھ اس طرح تقسیم نہیں کرتے کہ وہ (مال میں اتنے) برابر ہو جائیں۔ کیا پھر یہ لوگ اللہ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں؟ (سورۃ النحل: 71)

مشرکین کہ اچھی طرح جانتے تھے کہ زمین اور آسمان کا خالق و مالک صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہے۔ وہ اللہ کی ذات اور صفات سے بخوبی واقف تھے اور تسليم کرتے تھے کہ تخلیق، رزق، اور کائنات کا نظام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

**وَلَعِنَ سَأْلَتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ
اللَّهُ فَإِنِّي يُؤْفِكُونَ**

اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور سورج اور چاند کو (کس نے) مسخر کیا ہے، تو

وَهُوَ ضُرُورٌ كُلِّيٌّ لَّهُ نَّعَمْ (سورة العنكبوت: 61)

مشرکین کا مسئلہ یہ نہیں تھا کہ وہ اللہ کے وجود کا انکار کرتے تھے، ان کا انحراف اس بات سے تھا کہ وہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو اس کی صفات میں برابر کا شریک بناتے تھے۔ انہوں نے اللہ کے ساتھ بتوں، دیوتاؤں، اور فرشتوں کو ایسے مقام پر بٹھادیا، گویا وہ بھی اللہ کی بعض صفات میں شریک ہو سکتے ہیں، چاہے وہ حاجات پوری کرنے، دعائیں قبول کرنے، یا سفارش کے ذریعے اللہ کے فیصلوں پر اثر انداز ہونے کی شکل میں ہو۔ یہ عقیدہ کہ کوئی اور ہماری دعاوں کو اللہ تک پہنچانے کی طاقت رکھتا ہے یا سفارش کر سکتا ہے، ایک بنیادی، مطلقی اور اعتقادی غلطی ہے۔ یہ سوچنا کہ مخلوق اللہ کے ساتھ فیصلہ سازی، رحمت اور دیگر معاملات میں شامل ہے شرک کی ایک تنگین ترین صورت ہے جسے شرک فی الصفات کہا جاتا ہے۔ مشرکین یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ اللہ کے نافرمان اور گناہگار ہیں، اس لیے انہیں اپنی دعائیں اللہ تک پہنچانے کے لیے، اور اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے اور وہ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

أَلَا إِلَهَ إِلَّا دِينُ الْخَالِصُ وَالَّذِينَ أَتَّخَذُوا لِمِنْ دُونِهِ أُولَيَاءَ مَا نَعْبُدُ هُمْ إِلَّا
لِيُقْرَبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَ

جان لوک اطاعتِ خالص اللہ ہی کا حق ہے۔ اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا کچھ اور کو اولیاء بنایا ہوا ہے (وہ کہتے ہیں کہ) ہم تو ان کو صرف اس لیے پوچھتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں (سورۃ الزمر: 3)

آج بھی اس قسم کے شرک کی مختلف شکلیں مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں۔ کوئی قبروں کو سجدہ کرتا ہے، تو کوئی رسول اللہ ﷺ کو وسیلہ بناتا ہے، کوئی اولیاء اللہ کو مدد کے لیے پکارتا ہے تو کوئی پیروں اور فقیروں کے در کا سوالی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت کے ذریعے ہر طرح کے شرک کی نفی فرماتے ہیں کہ اللہ کی مخلوق چاہے رسول ہوں، نبی ہوں، ولی ہوں یا فرشتے، یہ سب کے سب اللہ کے عبد اور غلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول ﷺ، اللہ کی بہترین مخلوق ہیں لیکن انہیں بھی اللہ تعالیٰ نے قرآن میں متعدد جگہ اپنا عبد اور بندہ کہہ کر پکارا۔ انسان کے لیے سب سے بڑا شرف اور اعلیٰ مقام اللہ کا فرمانبردار اور عبادت گزار بندہ ہے۔ جب انسان اللہ کے دیے ہوئے مال میں اپنے غلام کو شریک نہیں بناسکتا تو اللہ اپنے بندوں کو اپنی صفات اور اختیارات میں برابر کا شریک کیسے ٹھہر اسکتا ہے؟

وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادَةِ جُزُءًا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورٌ مُّبِينٌ

ان لوگوں نے اس کے بندوں میں سے بعض کو اس کا جزو ٹھہرایا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کھلا احسان فراموش ہے (سورۃ الزخرف: 15)

سورة الزمر

طاغوت



ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيهِ شُرَكَاءُ مُتَشَكِّسُونَ وَرَجُلًا سَلِيمًا
لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا إِلَحْمَدُ اللَّهَ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ



الله نے مثال بیان فرمائی ہے ایک شخص کی جس میں بہت سے آپس میں ضدر کھنے والے آقا شریک ہیں اور ایک وہ شخص ہے جو پورے طور پر ایک ہی آقا کا غلام ہے کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کل تعریف اللہ کے لیے ہے لیکن ان کی اکثریت علم نہیں رکھتی

(سورۃ النمر : 29)

بچپنی مثال میں اللہ سبحان تعالیٰ نے شرک کی لفی کرتے ہوئے ہمیں بتایا کہ یہ کس قدر غیر فطری عقیدہ ہے اور اس مثال میں اللہ تعالیٰ ہمیں توجیہ کی منطق (logic) سمجھاتے ہیں۔ ذرا سوچیے ایک شخص ہے جو بہت سے آقاوں کی ملکیت ہے اور وہ آقا آپس میں مسلسل لڑتے بھگڑتے رہتے ہیں۔ اگر ایک آقا اسے کوئی کام کرنے کو کہتا ہے تو دوسرا اس کی ضد میں اسے کوئی اور کام کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ہر آقا اس غلام کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور جرگا اس پر اپنا حکم نافذ کرنا چاہتا ہے۔ ایسا غلام کس قدر پر بیٹھا اور ذہنی انتشار کا شکار ہو گا، کس کی بات مانوں اور کس کا نہ مانوں۔ یہی صورتحال آج کے دور میں ایک کمپنی کے ملازم کی مثال سے سمجھ سکتے ہیں جس کے کئی بازیز (boases) ہوں۔ ہر بار دوسرے کی ضد میں اس پر رعب ڈالتا ہے اور اپنی بات منوانا چاہتا ہے۔ ایسے ملازم کی نوکری اس کے لیے عذاب بن جاتی ہے، کیونکہ وہ کسی ایک کو بھی مکمل طور پر راضی نہیں کر پاتا۔

اس کے بر عکس وہ شخص کتنا سکون اور آرام میں ہو گا جو صرف ایک ہی آقا کا غلام یا نوکر ہے، اسی کی بات مانتا ہے، اسی کو خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اسی کا خدمت گزار ہے۔ ایسا شخص صرف ایک مالک کے حکم کا پابند ہے اور صرف اسی کی خوشنودی کے لیے کام کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مثال سے ہمیں سمجھانا چاہتے ہیں کہ اصل امن اور چین صرف ایک اللہ کی بندگی میں ہے۔ یہ انسان کے design کا حصہ ہے کہ انسان ایک وقت میں ایک ہی آقا کا غلام ہو سکتا ہے، اگر وہ ایک سے زیادہ آقاوں کی غلامی اختیار کرے تو کسی کو بھی راضی نہیں کر پائے گا۔

مولانا مودودی اس بات کی طرف خوبصورت انداز میں اشارہ کرتے ہیں کہ یہ مثال پھر کے بتوں کے بارے میں نہیں ہو سکتی کیونکہ بتوں میں نہ شعور ہوتا ہے، نہ حکم دینے کی طاقت۔ بلکہ یہ مثال تو ان زندہ آقاوں کی ہے جنہیں ہم اللہ کو چھوڑ کر اپنا خدا بنا لیتے ہیں۔ سب سے پہلا آقا تو انسان کا اپنا نفس ہے، جس کے اپنے مطالبے ہیں، اپنی فرمائشیں ہیں۔ یہ نفس جب آقا بن جائے تو یہ طرح طرح کی خواہشات انسان کے اندر پیدا کرتا ہے اور پھر انسان کو اپنا کہنا ماننے پر مجبور کرتا ہے۔ جو شخص نفس کی غلامی قبول کر لیتا ہے وہ اللہ کو کبھی راضی نہیں کر پاتا جیسا کہ سورۃ یوسف میں آتا ہے:

إِنَّ الْنَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّهِ إِنَّ رَبِّيْ غَفُورٌ رَّحِيمٌ

یقیناً (انسان کا) نفس تو برائی ہی کا حکم دیتا ہے سوائے اس کے جس پر میر ارب رحم فرمائے۔ یقیناً میر ارب بہت بخششے والا نہایت رحم کرنے والا ہے۔ (سورۃ یوسف: 53)

ایسے کئی آقا ہمیں زندگی کے مختلف شعبوں میں نظر آتے ہیں: گھروں میں، خاندانوں اور برادریوں میں، قوم اور معاشرے میں، کاروبار اور معیشت کے دائروں میں، مذہبی پیشواؤں یا حکمرانوں کی صورت میں۔ ہر آقا کے اپنے مطالبات اور تقاضے ہوتے ہیں، جنہیں پورا کرتے کرتے انسان تھک جاتا ہے، اور پھر بھی کسی کو مکمل طور پر راضی نہیں کر پاتا۔ گھریلو زندگی میں ہر رشتے کی اپنی

توقعات ہوتی ہیں، خاندان والے الگ امید یں باندھتے ہیں، اور معاشرہ اپنے معیار کا بوجھ انسان پر ڈال دیتا ہے۔ ان تمام مطالبات کو نبھانے کی تگ ودو میں انسان ساری زندگی دوڑتا رہتا ہے، ہر آقا سے اپنی طرف کھینچتا رہتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق چلنے پر مجبور کرتا ہے۔ مگر جو شخص اخلاص کے ساتھ اللہ کی بندگی اختیار کر لیتا ہے، وہ ان تمام معاشرتی اور معاشی زنجروں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص امن اور اطمینان کی کیفیت میں رہتا ہے، کیونکہ وہ اپنے نفس کی ناجائز خواہشات کو رد کر کے وہ تمام تقاضے جو اللہ کی مرضی کے خلاف ہوں، انہیں ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ ایک واحد اللہ کی غلامی میں ہی اصل آزادی ہے۔ غیر اللہ کی غلامی میں انسان کے لیے ذات و رسولی ہے جبکہ اللہ کی بندگی میں اصل عزت اور شرف ہے۔ یہی اصول کائنات کے نظام میں بھی کارفرما ہے۔

اگر ان دونوں (یعنی زمین و آسمان) کے اندر اللہ کے سوا کوئی اور معبد بھی ہوتے تو لازم یہ دونوں فساد سے بھر جاتے۔ تو اللہ جو عرش کا مالک ہے وہ ان باتوں سے پاک ہے جو یہ لوگ بناتے ہیں (سورۃ الانبیاء: 22)

جس طرح کائنات کا نظام ایک اللہ کی وحدانیت پر قائم ہے، اسی طرح انسان کا دل بھی سکون پاتا ہے جب اس کا معبد، مطلوب اور محبوب صرف اللہ کی ذات ہو۔ اگر زمین و آسمان میں ایک سے زیادہ معبد ہوتے تو فساد برپا ہو جاتا، اور اسی طرح جب انسان کے دل میں دوسری محبتیں اللہ کی محبت سے آگے بڑھ جاتی ہیں، تو اس کی ذات میں بھی انتشار اور فساد پیدا ہو جاتا ہے۔

جن لوگوں نے طاغوت کی بندگی سے احتساب کیا اور اللہ کی طرف رجوع کر لیا ان کے لیے خوشخبری ہے۔ پس
(اے نبی) بشارت دے دو میرے اُن بندوں کو (سورۃ الزمر: 17)

طاغوت کا مطلب حد سے تجاوز کرنے والی شے۔ جب سمندر کی لہریں حد سے تجاوز کر جائیں تو کہا جاتا ہے کہ سمندر میں طغیانی ہے۔ محبت کرنا انسان کی فطرت ہے اور انسان کے دل میں بھی اس طرح بہت سی محبتیں جمع ہو جاتی ہیں، لیکن اتنا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کوئی بھی محبت اپنی حد سے تجاوز کر کے اللہ کی محبت سے اوپر نہ جانے پائے۔ جب کسی بھی چیز کی محبت (چاہے وہ اپنے نفس کی محبت ہو، لوگوں کی، دولت کی یادنیا کی دوسری مادی چیزوں کی) اللہ کی محبت سے اوپر چلی جائے تو وہ طاغوت، اللہ اور آقا بن جاتی ہے۔

اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر کچھ اور چیزوں کو اس کا ہمسر اور مدن مقابلہ بنادیتے ہیں وہ ان سے ایسی محبت کرنے لگتے ہیں جیسی اللہ سے کرنی چاہیے اور جو لوگ واقعًا صاحب ایمان ہوتے ہیں ان کی شدید ترین محبت اللہ کے ساتھ ہوتی ہے (سورۃ البقرہ: 165)



سورة الحجرات

غريبت



وَلَا يَغْتَب بَعْضُكُم بَعْضًا إِيَّاهُ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُل لَحْمَ أَخِيهِ
مَيْتَنًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتْقُولُ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَاَبُ رَحِيمٌ

اور تم میں سے کوئی دوسرے کی غیبت نہ کرے۔ کیا تم میں سے کوئی شخص پسند کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ یہ تو تمہیں بہت ناگوار لگا، اور اللہ کا تقوی اختیار کرو اللہ توبہ کا بہت قبول فرمانے والا اور بہت رحم فرمانے والا ہے۔ (سورۃ الحجرات: 12)

سورۃ الحجرات میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے کئی معاشرتی برائیوں سے بچنے کا حکم دیا ہے۔ ان میں خاص طور پر غیبت سے سختی سے منع کیا اور اسے ایک انتہائی گھناؤ نے عمل سے تشبیہ دی تاکہ اس کی قباحت ہمارے دلوں پر واضح ہو جائے۔ عام طور پر لوگوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ اگر کسی انسان میں کوئی برائی موجود ہو، تو اسے سب کے سامنے ظاہر کرنا گویا ایک معاشرتی خدمت ہے۔ تاہم، یہی سوچ درحقیقت غیبت کے بنیادی تصور کو نظر انداز کرتی ہے۔ اسی لیے غیبت کے مفہوم کو سمجھنا ضروری ہے غیبت کا مطلب خود نبی کریم ﷺ نے ہمیں واضح طور پر سمجھایا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”کیا تم جانتے ہو کہ غیبت کیا ہے؟ ”صحابہ کرام نے عرض کی، ”اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اپنے بھائی کا ایسا نہ کرہ کرنا جو اسے ناپسند ہو“ صاحبہ نے سوال کیا، ”اگر میرے بھائی میں وہ بات واقعی موجود ہو جو میں کہتا ہوں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اگر وہ بات اس میں موجود ہے، تو تم نے غیبت کی اور اگر وہ بات اس میں نہیں ہے، تو تم نے اس پر بہتان لگایا۔“ (صحیح مسلم: 6593)

اللہ تعالیٰ نے غیبت کی سُگینی کو یوں بیان فرمایا: ”کیا تم میں سے کوئی اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟“ یہ تصور ہی انسان کو گھن اور نفرت دلاتا ہے، اور کوئی ذی شعور انسان ایسا گھناؤ نا عمل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ جانوروں میں بھی، صرف چند انتہائی درنہ صفت جانور ہیں جو اپنی ہی نسل کا گوشت کھاتے ہیں، یہ عمل جانوروں کے لیے بھی غیر معمولی اور غیر فطری سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سخت اور لرزہ دینے والی مثال اس لیے دی تاکہ ہمیں غیبت کی حقیقی قباحت اور سُگینی کا بھرپور احساس ہو سکے۔ جس طرح مردہ بھائی کا گوشت کھانا انتہائی مکروہ اور ناقابل تصور ہے، اسی طرح غیبت بھی اللہ کے نزدیک ایسا ہی گھناؤ نا اور سُگین گناہ ہے، چاہے ہم اسے کتنا ہی معمولی اور بے ضرر کیوں نہ سمجھیں۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ :

ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک آدمی جانے کے لیے کھڑا ہوا، اس کے جانے کے بعد ایک دوسرے آدمی نے جانے والے کوبرابھلا کھنائشروع کر دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اپنے دانتوں (پلے گلے گوشت) کو صاف کرو۔“ اس آدمی نے کہا، ”یا رسول اللہ جب میں نے گوشت نہیں کھایا تو کیوں صاف کروں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم نے اپنے بھائی کا گوشت کھایا ہے۔“ (المجمع الکبیر للطبرانی: 9951)

گوشت کھائے، اور وہ بھی انسان کا، جو کوئی اور نہیں بلکہ اپنا بھائی ہو؟ اللہ کے نزدیک کسی کی غیر موجودگی میں اس کی برائی کرنا بھی اتنا ہی سُگین اور گھناؤ نا عمل ہے، کیونکہ مردہ انسان اور غیبت کا شکار شخص، دونوں ہی اپنادفاع نہیں کر سکتے۔ کسی کی عزت پر پیٹھ پیچھے حملہ نہ صرف بڑے گناہ کا باعث ہے بلکہ سماجی تعلقات کو بھی تباہ کرتا ہے۔ اگر وہ شخص موجود ہو تو اپنی صفائی دے سکتا ہے، ہر طریقے سے اپنادفاع کرنے کی کوشش کر سکتا ہے لیکن غیر موجودگی میں اسے بے بس اور نہتا چھوڑنا ظلم ہے۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا گزر ایک مردہ خچر کے پاس سے ہوا تو آپ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا:

”تم میں سے کوئی اس مردہ خچر کا گوشت پیٹ بھر کر کھائے یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ اپنے بھائی کا گوشت کھائے۔“

انسان کے اعضا اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی ہوئی نعمتیں ہیں، چاہے وہ آنکھیں ہوں، کان ہوں یا زبان ہو۔ ان سب کے بارے میں اللہ تعالیٰ روز قیامت سوال فرمائیں گے کہ ان نعمتوں کو ہم نے اللہ کی خوشنودی کے لیے استعمال کیا یا اللہ کی نافرمانی کے لیے۔ اللہ تعالیٰ کی ہمارے ایک ایک لفظ پر گہری نظر ہے۔

کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکالتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک مستعد نگراں موجود نہ ہو (سورۃ ق: 18)

زبان کے گناہوں کے بارے میں ہمارے دین میں اس قدر تلقین اس لیے کی گئی کیونکہ یہ گناہ کرنا بہت ہی آسان ہے، مگر ان گناہوں کے ثڑات نہایت گہرے اور permanent ہوتے ہیں۔ ذرا سی زبان کی لغوش انسان کو اخلاقی پستیوں میں گرداتی ہے اور یہ گناہ اس لیے بھی خطرناک ہے کہ نہ تو دنیا کا کوئی قانون اس پر گرفت کرتا ہے اور نہ ہی اس پر پولیس پکڑتی ہے۔ زبان سے ادا کیے گئے الفاظ انسان کو جنت کی بلندیوں تک پہنچا سکتے ہیں، اور اسی زبان سے سرزد ہونے والی خطائیں اسے جہنم کے گڑھے میں دھکیل سکتی ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

بندہ اللہ کی رضامندی کے لیے ایک بات زبان سے نکالتا ہے، جسے وہ معمولی سمجھتا ہے، مگر اسی کی بدعت اللہ اس کے درجے بلند فرمادیتا ہے۔ اور ایک دوسرا شخص ایسا کلمہ زبان سے ادا کرتا ہے جو اللہ کی نار نسکی کا باعث ہوتا ہے، اور اسے بھی وہ معمولی جانتا ہے، مگر اسی کی وجہ سے وہ جہنم میں جا گرتا ہے۔

(صحیح بخاری: 6478)

زبان کے تین ایسے گناہ ہیں جن کے بارے میں سے اکثر لوگ، خاص طور پر عورتیں، غفلت کا شکار ہیں۔ ہم عموماً مغلفوں میں تفریح کے طور پر ان گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور اس سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں، حالانکہ ان کے نتائج نہایت نگین ہیں:

- غیبت: کسی مسلمان کی غیر موجودگی میں اس کا ایسا ذکر کرنا جو سے ناگوار گزرے۔
- بہتان: کسی شخص پر ایسی بات کا لازام لگانا جو حقیقت میں اس میں موجود نہ ہو، یعنی اس کے بارے میں جھوٹ گھٹنا۔
- چغلی: ایک فریق کی بات دوسرے فریق تک اس نیت سے پہنچانا کہ ان کے درمیان عداوت پیدا ہو۔

یہ تینوں گناہ اللہ کے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ ہیں اور ان کی سزا بہت سخت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

جب مجھے معراج کرائی گئی، تو میرا گزر ایسے لوگوں پر سے ہوا، جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ ان سے اپنے منہ اور سینے نوچ رہے تھے، میں نے پوچھا: جبراً میں! یہ کون لوگ ہیں؟ کہا: یہ وہ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے (غیبت کرتے) اور ان کی بے عزتی کرتے تھے۔ (سنن ابو داؤد: 4878)

سورة الحمد فریب کا سفر



أَعْلَمُوا إِنَّهَا الْحَيَاةُ الْدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهُوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَنَكَاثٌ
 فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ كَمِثْلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ
 فَتَرَاهُ مُصْفَرًا ثُمَّ يَكُونُ حَطَابًا وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ

وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَّعٌ الْغُرُورُ

جان لو کہ دنیا کی زندگی صرف کھیل، تماشہ، زینت، آپس میں فخر کرنے اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی دوڑ ہے۔ اس کی مثال اس کھیتی جیسی ہے جو بہترین بارش کے بعد (بھرپور سر سبز ہو جائے اور) کسانوں کو خوش کر دے۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ خشک ہو کر زرد پڑ جاتی ہے، اور آخر کار چورا چورا ہو (کر بکھر) جاتی ہے۔ اور آخرت میں یا تو بہت سخت عذاب ہے (یا پھر) اللہ کی طرف سے مغفرت اور (اس کی) رضا۔ اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کے ساز و سامان کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ (سورۃ الحمد: 20)



اللہ تعالیٰ اس آیت میں انسانی زندگی کے مختلف مراحل اور ان سے جڑی نفسیات کو نہایت گہرائی اور حکمت سے بیان فرماتے ہیں، گویا یہ زندگی ایک مسلسل سفر ہے، جہاں ہر عمر کے حصے میں انسان کی ترجیحات اور خواہشات بدلتی رہتی ہیں، مگر مقصد ایک ہی رہتا ہے: اپنی خواہشات کا پچھا کرنا اور انہیں پورا کرنا۔

بچپن میں زندگی "العِبَد" یعنی کھلی کوڈ کے گرد گھومتی ہے۔ لڑکوں کے لیے toys اور بچیوں کے لیے ان کی گڑیاں ان کی زندگی کا محور ہوتی ہیں۔

پھر "کَهُو" کا دور آتا، جب انسان تھوڑا بڑا ہوتا ہے تو سمجھ آتا ہے دنیا میں اور بھی entertainment گیمز وغیرہ۔ اور پھر پورا لڑکپن اسی تفریح میں گزر جاتا ہے۔

نوجوانی اور teenage میں داخل ہوتے ہی انسان "زینَة" یعنی اپنی ظاہری خوبصورتی اور شکل و صورت کی فکر کرنے لگتا ہے۔ پھر کھلونوں کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ لڑکیاں ہر وقت میک اپ اور بناؤ سلگھار میں لگی رہتی ہیں اور لڑکے بھی زیادہ وقت شیشے کے سامنے ہی گزارتے ہیں۔

پھر تھوڑا جوانی میں قدم پڑتا ہے تو خواہشات ایک بار پھر کروٹ بدلتی ہیں، اب انسان اپنی کامیابیوں اور achievements میں "تفَاخُر" یعنی فخر محسوس کرنے لگتا ہے۔ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ کس یونیورسٹی میں گئے، کہاں نوکری کی، کونسی گاڑی خریدی، یہی انسان کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش اور محور بن جاتا ہے۔

اوھیڑ عمر میں پہنچ کر باقی تمام خواہشیں اور کوششیں مند پڑ جاتی ہیں اور انسان "تَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأُولَئِ" یعنی اولاد اور مال میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی دوڑ میں لگ جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ جائیداد اور بینک بیلنس جمع کرنے کے ساتھ، انسان اپنی اولاد کے لیے بہترین موقع فراہم کرنے میں جutt جاتا ہے اور پھر آخری دم تک بس یہی کرتا رہتا ہے۔ انسان ایک خواہش کے بعد دوسری کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے، یہاں تک کہ زندگی کی شام ہو جاتی ہے اور یوں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ انہی فریبیوں کی نظر کر دیتا ہے اور اسی حال میں قبر تک جا پہنچتا ہے۔

تم لوگوں کو تکاثر (یعنی زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن) نے غفلت میں ڈال رکھا ہے۔ یہاں تک کہ تم قبروں کو پہنچ جاتے ہو۔ (سورۃ التکاثر: 1-2)

اللہ تعالیٰ انسان کی زندگی کے ان مراحل کا ذکر کر کے ہمیں یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ ہر قدم پر ایک نیافریب اور نئی غفلت انسان کو اپنی لپیٹ میں لیے رکھتی ہے۔ کھلی تماشے سے لے کر مال اور اولاد کی دوڑتک، ہر مرحلے میں انسان ایک دھوکے سے نکل کر دوسرے فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایک خواہش پوری ہونے پر نئی خواہش جنم لیتی ہے، ایک خواب ختم ہوتے ہی دوسرے خواب دل پر حاوی ہو جاتا ہے، اور یوں انسان ساری زندگی distractions اور غفلت کا شکار رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ کی یاد اور اس کی محبت تک پہنچنے کی راہ کھو بیٹھتا ہے۔

اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے ربِ کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا (سورہ الانفطار: 6)

اللہ تعالیٰ اس خواہشات کی ناختم ہونے والی داستان کی ایک نہایت خوبصورت تمثیل بیان فرماتے ہیں۔ جیسے آسمان سے بارش ہوتی ہے، جس سے فصلیں ہری بھری ہو جاتی ہیں، اور کسان اس ہریالی کو دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھتا ہے۔ بارش اپنے ساتھ رزق اور خوشی کی امید لاتی ہے اور فصل اپنی پوری طاقت اور خوبصورتی پر پہنچتی ہے۔ مگر یہ رونق عارضی ہے، اگر کسان غفلت بر تے تو فصل زرد ہو کر مر جھا جاتی ہے، اور اگر کاٹ بھی لمی جائے، تو پچھے صرف خشک بھوسا باقی رہ جاتا ہے، جو آخر کار ہوا میں بکھر جاتا ہے۔

یہی بے شائقی ان دنیاوی خواہشات کی ہے۔ انسان کے دل میں ایک خواہش جاگتی ہے، پھر دل میں قوت پکڑتی ہے اور لگتا ہے کہ بس مجھے اب دنیا میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہیے لیکن جیسے ہی وہ چیز مل جاتی ہے تو وہ پیلی پڑ جاتی ہے، انسان کا دل اس سے بھر جاتا ہے اور پھر انسان کسی اور چیز کے پچھے بھاگنا شروع کر دیتا ہے۔ جیسے ایک بچہ صح شام کسی کھلونے کی ضد کرتا ہے اور جب وہ مل جائے تو ایک ہی ہفتے میں اس کھلونے کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے، وہ کھلونے کسی ٹوکری میں پڑا ملتا ہے اور پچھے کسی اور کھلونے کی ضد شروع کر دیتا ہے۔ ایک گاڑی کے بعد دوسری گاڑی، ایک گھر کے بعد دوسرਾ گھر، ایک موبائل فون کے بعد دوسرਾ موبائل فون، نئے سے نئے ماڈل، نئے سے نئے ٹیزرائن۔ اس طرح یہی خواہشات بنتی جاتی ہیں اور پچھلی پیلی پڑ جاتی ہیں اور پھر چورا چورا ہو کر ہوا میں بکھر جاتی ہیں۔ یو نہیں اپنی خواہشات کا تعاقب کرتے کرتے انسان قبر تک پہنچ جاتا ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ:

اگر انسان کے پاس مال کی دو وادیاں ہوں تو تیسرا کا خواہشمند ہو گا اور انسان کا پیہٹ مٹی کے سوا اور کوئی چیز
نہیں بھر سکتی (صحیح بخاری: 6436)

دنیا کی زندگی ایک عارضی زندگی ہے اس کی خوشیوں کو بھی فنا ہے اور غمتوں کو بھی، اس کی بہار بھی عارضی ہے اور اس کی خزاں بھی۔ دل بھلانے کے لیے یہاں بہت کچھ ہے جسے حقیقت سمجھ کے انسان دھوکے میں پڑ جاتا ہے اور سارا وقت اسی دنیا کی فانی خواہشات کو حاصل کرنے میں گزار دیتا ہے۔ جیسے جیسے عمر بڑھنے لگتی ہے، انسان بوڑھا ہو جاتا ہے، پھر نہ کچھ کھاپی سکتا ہے، نہ جسم میں طاقت رہتی ہے، دیکھتے ہی دیکھتے اس دنیا کی تمام کامیابیاں，achievements، لطف اور لذتیں انسان کی آنکھوں کے سامنے پیلی پڑ جاتی ہیں اور چورا چورا ہو کر ہوا میں بکھر جاتی ہیں۔ اس کے بر عکس آخرت کی زندگی بہتر اور ابدی ہے، اگر انسان دنیا کے دھوکے میں پڑنے کے بجائے آخرت کی زندگی کے لیے کوشش کرتا تو بڑا ہی نفع کا سودا تھا۔

دھوکہ ہے اک فریب ہے منزل کا ہر خیال سچ پوچھیے تو سارا سفر واپسی کا ہے



سورة الحشر

قرآن کی تاثیر

لَوْ أَنْزَلْنَا هَذَا الْقُرْءَانَ عَلَى جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ
خَشْيَةِ اللَّهِ وَتُلْكَ الْأُمَّالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ

اگر ہم نے یہ قرآن کسی پھاڑ پر اتارا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے جھک جاتا اور
رسیزہ رسیزہ ہو جاتا۔ یہ مشا لیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور و فکر کریں

(سورۃ الحشر: 21)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ قرآن کی عظمت اور تاثیر کی مثال بیان فرماتے ہیں کہ یہ قرآن اگر پہلا جیسی عظیم، مطبوع اور ٹھوس تخلیق پر بھی نازل ہوتا تو وہ اللہ کے خوف سے نرم پڑ جاتا، دب جاتا اور سرزہ ہو کر ہوا میں بکھر جاتا۔ یہ انسان کے لیے عبرت کا مقام ہے کہ اللہ کے کلام کی عظمت سے پہلا جیسی ناقابل تغیر اور عظیم مخلوق بھی پاش پاش ہو جاتی ہے، لیکن افسوس کہ مکمل شعور اور ارادہ رکھنے کے باوجود انسان کے دل پر اس قرآن کو پڑھ کر کوئی خوف طاری نہیں ہوتا۔ یہ اس بات کی نشاندھی ہے کہ کفر اور نفاق انسان کے دل کو پھروں سے بھی زیادہ سخت کر دیتے ہیں۔

انسان اللہ کا کلام سنتا ہے، پڑھتا ہے، سمجھتا بھی ہے لیکن اکثر اس کا دل بے حصی اور غفلت میں ڈوب رہتا ہے۔ انسان کے دل میں کبھی یہ خوف نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کے زریعے جو خلافت اور امامت کی بھاری ذمہ داریاں انسان پر ڈالی ہیں اس کے بارے میں وہ اللہ کو آخرت کے دن کیا جواب دے گا؟ انسان بے خوف، لاپرواہ اپنے کھیل تماشوں میں لگا رہتا ہے جیسے اس پر کوئی بوجھ ہی نہ ہو۔ جبکہ اگر یہی قرآن کا بوجھ کسی پہلا پڑھا جاتا تو وہ اس ذمہ داری اور جواب دی کے خوف سے سرزہ سرزہ ہو جاتا۔

ہم نے اس امامت (خلافت) کو آسمانوں، اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے، مگر انسان نے اسے اٹھالیا، یقیناً وہ بڑا خالم اور بڑا نادان تھا۔ (سورۃ الاحزاب: 72)

دولوں کی سختی انسان کی فطرت کا حصہ نہیں بلکہ غفلت اور نافرمانی کا نتیجہ ہے۔ دولوں میں خیشتِ الہی اور ذکرِ الہی سے نرمی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن مسلسل غفلت اور اللہ کی یاد سے دوری نہیں پھروں سے بھی زیادہ سخت بنا دیتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ میں یہودیوں سے فرمایا:

ثُمَّ قَسْتُ قُلُوبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً

پھر اس کے (یعنی تمام نشانیاں دیکھنے کے) بعد تمہارے دل سخت ہو گئے۔ گویا وہ پھر ہوں یا ان سے بھی زیادہ سخت۔ (سورۃ البقرۃ: 74)

اس کے برعکس، وہ دل جو اللہ کے ذکر اور آخرت میں اللہ کی ملاقات کے خوف سے معمور ہوں، نہ صرف نرم ہو جاتے ہیں بلکہ اللہ کے ذکر اور قرآن کی تلاوت سے لرزنے لگتے ہیں۔ یہی کیفیت ایمان کی علامت ہے۔

إِنَّمَا أَلْمَؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجَاءُتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيهِمْ عَلَيْهِمْ عَائِتُهُ
زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ

حقیقی مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں اور جب انہیں اس کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے رب ہی پر توکل کرتے ہیں۔ (سورۃ الافال: 2)

حَشِّعًا کا لفظ خشوع سے ہے یعنی عاجزی، انساری، اللہ کے خوف سے انسان کے اعضا کا نرم پڑ جانا، آنکھوں سے آنسوں جاری ہونا اور اللہ کے سامنے مکمل طور پر جھک جانا۔ اور مُتَصَّلِّ عَمَّا سے مراد کانپ اٹھنا، لرز جانا، روگھٹے کھڑے ہو جانا ہے۔

اللہ نے سب سے بہترین بات (اپنا کلام) نازل کیا، ایک ایسی کتاب (کی شکل میں) جو (مضامین میں) ہم آپنگ ہے اور بار بار دہرائی جاتی ہے۔ اسے سن کر ان لوگوں کے جسم پر (اللہ کے خوف سے) کمکپی طاری ہو جاتی ہے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، پھر ان کے دل اور جسم اللہ کی یاد سے نرم پڑ جاتے ہیں۔ (سورۃ الزمر: 23)

نبی پاک ﷺ اور صحابہ کرام جب قرآن کی تلاوت کرتے تو اللہ کے خوف سے بے اختیار رونے لگتے۔ عبد اللہ بن الشیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ :

میں نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا، اس وقت آپ نماز پڑھ رہے تھے، اور آپ کے سینے سے ایسی آواز آرہی تھی جیسے ہاندھی ابل رہی ہو یعنی آپ (زار و قطار) رورہے تھے (سنن نسائی: 1215)

رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیماری میں فرمایا کہ ابو بکر (رضی اللہ عنہ) سے نماز پڑھانے کے لیے کہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اگر ابو بکر رضی اللہ عنہ آپ کی جگہ کھڑے ہوئے تو ان کے رونے کی شدت کی وجہ سے لوگ ان کی آواز نہیں سن پائیں گے۔

آج ہم قرآن سنتے بھی ہیں اور پڑھتے بھی ہیں تو ہمارے دل پر قرآن کا ایسا اثر کیوں نہیں ہوتا۔ ہمارے دل کیوں نہیں کانتے، ہم اللہ کے ڈر سے اس کے آگے کیوں نہیں جھکتے، ہماری آنکھوں سے آنسوں کیوں نہیں گرتے؟

کیا ایمان لانے والوں کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے پُلچل جائیں اور اس کے نازل کردہ حق کے آگے جھک جائیں۔ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ایک لمبی مدت ان پر گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور آج ان میں سے اکثر فاسق بنے ہوئے ہیں؟

(سورۃ الحید: 16)

سورة الجمع بدترین مثال



مَثَلُ الَّذِينَ حَمِلُوا التَّوْرَةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْجِنَارِيَّ حِمْلٌ
أَسْفَارًا بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا إِعْبَادَيْتِ اللَّهِ وَاللَّهُ لَا
يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ

جن لوگوں کو تورات کا حامل بنایا گیا، پھر وہ اس کا بوجھ نہ اٹھا سکے، ان کی مثال اس گدھے جیسی ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ کیا ہی بری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھپٹلایا! اور اللہ خالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔

(سورۃ الجم۹عہ : 5)

اس آیت میں اللہ سبحان و تعالیٰ یہودیوں کی مثال دیتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے تمام قوموں پر فضیلت دی، ان کو ہر نسل میں نبیوں کے زریعے ہدایت عطا فرمائی اور سب سے بڑھ کر کلام الہی یعنی تورات جیسی نعمت سے نواز۔ لیکن انہوں نے اس نعمت کا حق ادا نہیں کیا۔

يَأَيُّهَا أَيُّهَا إِلَيْكُمْ أَذْكُرُ وَإِنِّي نُعْتَقِدُ أَنَّمَا نَعْمَلُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ

اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری اس نعمت کو جس سے میں نے تمہیں نوازا تھا اور اس بات کو کہ میں نے تمہیں دنیا کی ساری قوموں پر فضیلت عطا کی تھی (سورۃ البقرۃ: 47)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کی مثال گدھے کی سی ہے کہ جس پر بڑی بڑی کتابوں کا بوجھ لا دیا گیا ہو لیکن وہ نہیں جانتا کہ اس کی پیٹھ پر کیا علم کا خزانہ ہے۔ نہ تو یہ گدھا اس علم کی قدر جانتا ہے اور نہ ہی اس سے کسی قسم کا کوئی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ یہی حال بنی اسرائیل کا تھا ان پر کتاب تو نازل ہو گئی لیکن وہ اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکے، اس کی قدر نہیں کر سکے۔ ویسے تو بنی اسرائیل خود کو صاحب علم سمجھتے تھے، عربوں کو اپنے مقابلے میں ان پڑھ جاہل سمجھتے تھے لیکن لَمَّا يَحْمِلُوهَا كَمَ طَلَبَ يَرَ كَهْ هی وہ حقیقی معنوں میں کتاب پر عمل کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکے۔ وہ دعویٰ تو کرتے تھے کہ ان کے پاس اللہ کا کلام ہے، لیکن ان کی زندگیوں میں اس کا کوئی ہر دکھانی نہ دیتا، اسی عمل کی کمی نے انہیں گدھوں کے برابر لا کھرا کیا۔

تورات پر عمل کا ایک تقاضا یہ بھی تھا کہ وہ نبی پاک ﷺ پر سب سے پہلے ایمان لاتے، قرآن کو پہچانتے کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور تورات کی تصدیق کرنے آیا ہے لیکن یہودیوں نے اپنے ذاتی مفادات کے لیے سب سے پہلے انکار کیا۔

وَعَامِنُوا بِمَا أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرِيهِ

اور ایمان لاؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے جو تصدیق کرتے ہوئے آئی ہے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے اور تم ہی سب سے پہلے اس کا کفر کرنے والے نہ بن جاؤ (سورۃ البقرۃ: 41)

سورۃ البقرۃ میں اللہ تعالیٰ تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے کیسے اللہ کے احکامات کا انکار کیا، انہیں مذاق کا نشانہ بنایا اور عمل سے بچنے کے لیے چور راستے اختیار کیے۔ یہ لوگ اللہ کی کتاب کے حامل ہونے پر فخر تو کرتے تھے، مگر اپنی زندگیوں میں اس کتاب کو نافذ نہ کر سکے، بالکل اس گدھے کی مانند جس پر کتابوں کا بوجھ تو لا دیا جائے، لیکن وہ ان کا مطلب سمجھنے یا ان سے کوئی فائدہ حاصل کرنے کی قابلیت نہ رکھتا ہو۔

قرآن ہدایت کی کتاب ہے، اس کا مقصد محض کہانیاں سنانا یا رسماں و رواج کا حصہ بنانا نہیں۔ اس کتاب میں جب بھی پچھلی قوموں کی غلطیوں کا ذکر ہوتا ہے، اس کا مقصد ہمیں سبق دینا اور ان لغزشوں سے بچانا ہوتا ہے جو ان سے سرزد ہوئیں۔ یہ آیات ہمارے لیے

لمحہ فکریہ ہیں کہ قرآن کی بھاری ذمہ داری جو ہم پر ڈالی گئی ہے کیا ہم نے اس کا حق ادا کر دیا؟ بد قسمتی سے آج امت مسلمہ کا رویہ دیکھیں تو ہم نے قرآن کو محض تہرک اور زینت کا ذریعہ بنالیا ہے، اسے جزوں میں لپیٹ کر الماریوں کے بالا خانوں میں رکھنا ہی دین داری سمجھا جاتا ہے۔ یہ روشن ہمیں بنی اسرائیل کی مثال کے قریب لے جاتی ہے، جنہوں نے کتاب کو پایا مگر عمل سے گریز کیا اور ہم سمجھتے ہیں کہ شاید ایسا کرنے سے ہم نے قرآن کا حق ادا کر دیا۔

وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے وہی ہیں جو اس پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اس کا کفر کرے گا تو ہی لوگ ہیں خسارے میں رہنے والے۔ (سورۃ البقرۃ: 121)

تلاوت: (تلہ) کے معنی کسی کے پیچھے ایسے چنانکہ بیچ میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔ عربی زبان میں تلاوت کا مطلب پڑھنا نہیں بلکہ اتباع کرنا ہے۔ قرآن کے ہمارے اور کچھ حقوق ہیں اور اگر ہم نے یہ حقوق پورے نہ کیے تو پھر ہماری مثال بھی گدھوں کی سی ہو جائے گی۔ قرآن اور حدیث کے مطابق اس کتاب کے ہمارے اور چار حقوق ہیں۔

- **پڑھنا:** پہلا حق یہ ہے کہ قرآن کو پڑھا جائے، جزوں میں لپیٹ کر رکھنے کے بجائے قرآن کے ساتھ ایک تعلق بنا�ا جائے، اسے ہر روز خوبصورت تجوید اور خوبصورت آواز سے پڑھا جائے، حفظ کیا جائے۔ قرآن کو صرف رمضان میں نہیں بلکہ پورے سال اپنی زندگی کا حصہ بنایا جائے۔
- اس کی آیات پر غور و فکر کرنا ہے۔ قرآن کا حق صرف پڑھ لینے سے ادا نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ ہدایت کی کتاب ہے، تو جو اسے سمجھے بغیر پڑھے اسے اس کتاب سے ہدایت کیے حاصل ہو سکتی ہے؟
- **عمل:** قرآن کا اصل اور سب سے بڑا حق یہ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ زندگی کے ہر فیصلے میں خوشی، غمی، شادی، طلاق، پیدائش اور وفات ہر معاملے میں اللہ کی کتاب کو کھول کر ہدایت حاصل کی جائے۔ زندگی کا ہر قدم قرآن کی روشنی میں اٹھایا جائے۔ یہی اصل تلاوت ہے کہ قرآن کے پیچھے ایسے چلا جائے کہ بیچ میں کوئی اور چیز حائل نہ ہو سکے۔
- **نصیحت:** آخری حق یہ ہے کہ اس قرآن کے ذریعے دوسروں کو نصیحت کی جائے۔ قرآن کا علم لوگوں تک پہنچایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کو ذکر کہا، یعنی نصیحت۔

فَذَكِّرْ بِالْقُرْءَانِ مَن يَخَافُ وَعِيدِ

بس تم اس قرآن کے ذریعہ سے ہر اس شخص کو نصیحت کر دو جو میری تنبیہ سے ڈرے (سورۃ ق: 45)

اگر ہم نے قرآن کے یہ چار حقوق ادا کر دیئے تو ہم اللہ کے سامنے جواب دینے کے قابل ہو سکیں گے کہ اللہ نے جو ذمہ داری ہم پر ڈالی تھی ہم کچھ حد تک وہ بوجھ اٹھا پائے ہیں اور نہ ہم میں کوئی فرق نہیں۔

سورة التحريم

ما حول اور ايمان



ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلنَّاسِ كَفَرُوا لَأُمْرَاتٍ نُوحٌ وَأُمْرَاتٍ لُوطٌ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَلِحِيْنِ فَخَانَتَاهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَقِيلَ أَدْخُلَا الْنَّارَ مَعَ الْأَلْدَخِلِيْنَ - وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلنَّاسِ إِذَا مَنُوا أُمْرَاتٍ فِرْعَوْنَ إِذْ قَالَتْ رَبِّ أَبْنِ لِي إِنَّكَ بَيْتَنَا فِي الْجَنَّةِ وَنَجَّنِي مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمِيلِهِ وَنَجَّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِيْنَ - وَمَرْيَمَ ابْنَتِ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهِ وَكَانَتْ مِنَ الْقَلِيلِيْنَ

اللہ کافروں کے لیے نوح اور لوط کی بیویوں کو بطور مثال پیش کرتا ہے۔ وہ دونوں ہمارے دو صالح بندوں کی زوجیت میں تھیں، مگر انہوں نے اپنے ان شوہروں سے خیانت کی اور وہ (یعنی ان کے شوہر) اللہ کے مقابلہ میں ان کے کچھ بھی کام نہ آسکے اور انہیں کہا گیا: 'تم دونوں آگ میں داخل ہو جاؤ ان کے ساتھ جو داخل ہو رہے ہیں۔

اور اہل ایمان کے لیے اللہ فرعون کی بیوی کی مثال پیش کرتا ہے جبکہ اس نے دعا کی "اے میرے رب، میرے لیے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنادے اور مجھے فرعون اور اس کے (ظالمانہ) عمل سے نجات دے، اور مجھے (اس) ظالم قوم سے نجات دلوادے۔" اور مریم بنت عمران کی مثال (بیان کی گئی)، جنہوں نے اپنی پاک دامنی کی حفاظت کی، پھر ہم نے ان کے اندر اپنی روح میں سے پھونکا، اور انہوں نے اپنے رب کے کلمات اور اس کی کتابوں کی تقدیریق کی، اور وہ فرمانبرداروں میں سے تھیں۔ (سورۃ التحریم: 10-12)

سورہ تحریم کی ان آخری آیات میں اللہ سبحان و تعالیٰ تین طرح کی عورتوں کی مثالیں دے کر اس بات کی وضاحت فرماتے ہیں کہ ماحول، قربی رشتہ، حالات، یادنیاوی تعلقات کسی کے ایمان پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ ماحول چاہے سازگار ہو یا مشکل انسان کی کامیابی کا اصل دار و مدار صرف اور صرف ذاتی عقیدے اور اعمال پر ہے۔

پہلی مثال: حضرت نوح اور حضرت لوط کی بیویاں: حضرت نوح اور لوط علیہما السلام اللہ کے انبیاء اور صالح بندوں میں سے تھے۔ ان کا کام بھی باقی انبیا کی طرح تبلیغ اور لوگوں تک اللہ کا یہی قیام پہنچانا تھا، نہ صرف ان کی قوم نے ان کا انکار کیا بلکہ خود ان کی اپنی بیویوں نے ان کے ساتھ بے وفاً اور خیانت کی یعنی حق کو مسترد کر دیا اور اپنے شوہروں کی نافرمانی کی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کو جہنم کی آگ میں ڈال دیا اور ان کے شوہر ان کے کچھ کام نہ آسکے۔ اس آیت سے اللہ تعالیٰ ہمیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قیامت کے دن صرف انسان کا ذاتی عمل اس کے کام آئے گا اور کسی قسم کی کوئی نسبت، تربیت یا رشتہ داری کوئی فائدہ نہیں پہنچاسکے گی۔ یہاں تک کہ اگر نبی کی بیوی یا اولاد بھی کافر ہوں تو وہ پغمبر انہیں بھی جہنم کی آگ سے نہیں بچاسکتے۔ اس دن ہر کسی نے اپنے کیے کا خود جواب دینا ہے۔

اور سب قیامت کے دن اکیلے اس (اللہ) کے سامنے حاضر ہونے والے ہیں (سورہ مریم: 95)

نبی اکرم ﷺ اپنے خاندان والوں، رشتہ داروں یہاں تک کہ اپنی بیٹی حضرت فاطمہ رضی تعالیٰ عنہا سے کہا کرتے تھے:

اللہ کی اطاعت کے ذریعہ اپنی جانوں کو اس کے عذاب سے بچاؤ (اگر تم شرک و کفر سے باز نہ آئے تو) اللہ کے ہاں میں تمہارے کسی کام نہیں آؤں گا۔ اے بنی عبد مناف! اللہ کے ہاں میں تمہارے لیے بالکل کچھ نہیں کر سکوں گا۔ اے عباس بن عبد المطلب! اللہ کی بارگاہ میں میں تمہارے کچھ کام نہیں آسکوں گا۔ اے صفیہ، رسول اللہ کی پھوپھی! میں اللہ کے یہاں تمہیں کچھ فائدہ نہ پہنچا سکوں گا۔ اے فاطمہ! محمد ﷺ کی بیٹی! میرے مال میں سے جو چاہو مجھ سے لے لو لیکن اللہ کی بارگاہ میں، میں تمہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا سکوں گا۔
(صحیح بخاری: 4771)

آج بھی بہت سے مسلمانوں کا خیال ہے کہ ان کا عمل چاہے کیسا بھی ہو نبی پاک ﷺ کی شفاعت، اولیا کرام کی نسبت یا کسی مرشد کی خدمت انہیں قیامت کے دن اللہ کے عذاب سے بچا لے گی۔ اس آیت سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ قیامت کے دن ایک ہی چیز کام آئے گی اور وہ ہے اپنا عمل۔

کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرا کا بوجھ نہیں اٹھائے گا (سورہ الانعام: 164)

ہاں بہر حال اس دنیا میں انسان نیک ماحول اور اچھی صحبت سے فائدہ اٹھائے اور ایک دوسرا کو دوزخ کی آگ سے بچانے کی کوشش کرے۔

دوسری مثال فرعون کی بیوی یعنی حضرت آسیہ رحم اللہ کی ہے۔ حضرت آسیہ مصر کی ملکہ تھیں، چاہتیں تو دنیاوی آسائشوں سے بھرپور زندگی گزار تیں، عالی شان محلات میں رہتیں لیکن آپ حضرت موسیٰ کے محبوزات دیکھ کر اللہ پر ایمان لے آئیں۔ جب فرعون کو پتا چلا تو اس نے آپ سے تمام آسائشوں چھین لیں اور آپ پر تشدد اور سخت ترین اذیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ وہ اعلیٰ خاتون تھیں جنہوں نے کفر میں رہ کر ایمان کے اعلیٰ ترین درجے پا لیے۔ فرعون کے محلات کو ٹھکرایا اور جنت میں اللہ کے قریب ایک گھر کی خواہش میں ہر طرح کی اذیت برداشت کی۔ روایات میں آتا ہے کہ فرعون نے حضرت آسیہ کے ہاتھوں پیروں میں میخیں گاڑ دیں، جب حضرت آسیہ نے اللہ سے دعا کی تو اللہ نے انہیں جنت میں ان کا گھرد کھادیا، جسے دیکھ کر ان کی تمام تکفیفیں دور ہو گئیں اور وہ مسکرانے لگیں۔

اس مثال سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ شدید کفر کے ماحول اور بدترین صحبت میں رہنے کے باوجود بھی انسان اگر چاہے تو ایمان کے اعلیٰ ترین درجوں تک پہنچ سکتا ہے۔ قیامت کے دن کوئی یہ معدرت نہیں پیش کر سکتا کہ میرے والدین کافر تھے، میرے شوہر یا بیوی نے مجھے اللہ کی نافرمانی پر اکسیا، میرے دوست یا میری صحبت مجھے لے ڈوبی۔ اگر کوئی یہ عذر پیش کر سکتا تو حضرت آسیہ دنیا کی آسائشوں میں زندگی گزار تیں اور آخرت میں یہ بہانہ پیش کر دیتیں۔ اسلام کے احکامات پر چنان اور حقیقی ایمان تک پہنچا ہر فرد کا ذاتی فیصلہ (personal choice) ہے، اس معاملے میں ماحول، صحبت یا کسی نسبت کو قصور وار نہیں ظہرا جا سکتا۔

تیسرا مثال حضرت مریم سلام علیہا کی ہے کہ جو بہترین ماحول میں پیدا ہوئیں، نیک ماں باپ کی اولاد تھیں، پھر حضرت ذکر یا علیہ سلام کی کفالت میں مسجد اقصیٰ میں پلی بڑھیں۔ اس نیک ماحول اور بہترین صحبت نے آپ کو کامل ایمان تک پہنچا دیا۔

اور یاد کرو جبکہ کہا弗شوں نے اے مریم یقیناً اللہ نے تمہیں چن لیا ہے اور تمہیں خوب پاک کر دیا ہے اور تمہیں
تمام جہان کی خواتین پر ترجیح دی ہے (سورہ آل عمران: 42)

نیک اور صالح ماحول انسان میں بعض اوقات جھوٹی تسلی اور برتری کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔ یہ خیال ذہن میں جگہ بنا لیتا ہے کہ انسان صرف اپنی صحبت یا نیک لوگوں کی قربت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی نظر میں خاص ہے۔ بنی اسرائیل میں بھی اسی طرح گرور اور احساس برتری پیدا ہو گیا تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان بہت سے انبیاء بھیجے تھے۔ اس بنا پر وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ وہ اللہ کے خاص پنے ہوئے لوگ ہیں اور ان کی نجات یقینی ہے، اعمال چاہے جیسے بھی ہوں۔ اس کے بر عکس، حضرت مریم (علیہ السلام) نے کبھی بھی اس سوچ کو اپنے دل میں جگہ نہیں دی۔ انہوں نے طویل اوقات عبادت میں گزارے اور اپنی پاک امنی کی حفاظت کی، جیسا کہ قرآن میں بھی ذکر ہے کہ انہوں نے اپنے دامن کو ہر گناہ سے محفوظ رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس لیے نہیں چُنا کہ وہ نیک لوگوں کے درمیان تھیں، بلکہ ان کی فضیلت ان کے اپنے اعمال اور اللہ کے ساتھ مضبوط تعلق کی بنیاد پر تھی۔ نیک ماحول اور نیک لوگوں کی قربت یقیناً اہمیت رکھتی ہے، لیکن فرد کا اپنا عمل اور اللہ کے ساتھ تعلق سب سے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمیں اپنی کوششوں کو اپنی ذاتی عبادت اور نیک عمل کی جانب مرکوز کرنا چاہیے، کیونکہ یہی حقیقی معیار ہے جس کے ذریعے ہم اللہ کی رحمت اور قربت حاصل کر سکتے ہیں۔

انتساب

اس کتاب میں قرآن کی آیات مندرجہ ذیل ویب سائٹ سے بلا تبدیلی اخذ کی گئی ہیں:

<https://www.quran.com>

- 1 - قرآنی آیات کا ترجمہ اور تفسیر مندرجہ ذیل علماء سے لیا گیا ہے

ڈاکٹر اسرار احمد

مولانا تقی عثمانی

مولانا مودودی

مولانا جو ناگٹھی

- 2 - تصاویر:

Adobe AI, Midjourney AI

دیگر

- 3 - احادیث کو مندرجہ ذیل ویب سائٹ سے نقل کیا گیا ہے:

<https://hamariweb.com>

<https://sunnah.com>

اسلام 360

- 4 - اس کے لیے علاوہ ریسرچ کے لیے مندرجہ ذیل نقایر استعمال کی گئی ہیں:

تفسیم القرآن - سید ابوالا علی مودودی

بیان القرآن (ڈاکٹر اسرار احمد)

تفسیر مولانا تقی عثمانی

تفسیر ابن کثیر

- 5 - قرآن کورٹوکور (Quran cover to cover) نعمان علی خان www.bayyinah.tv